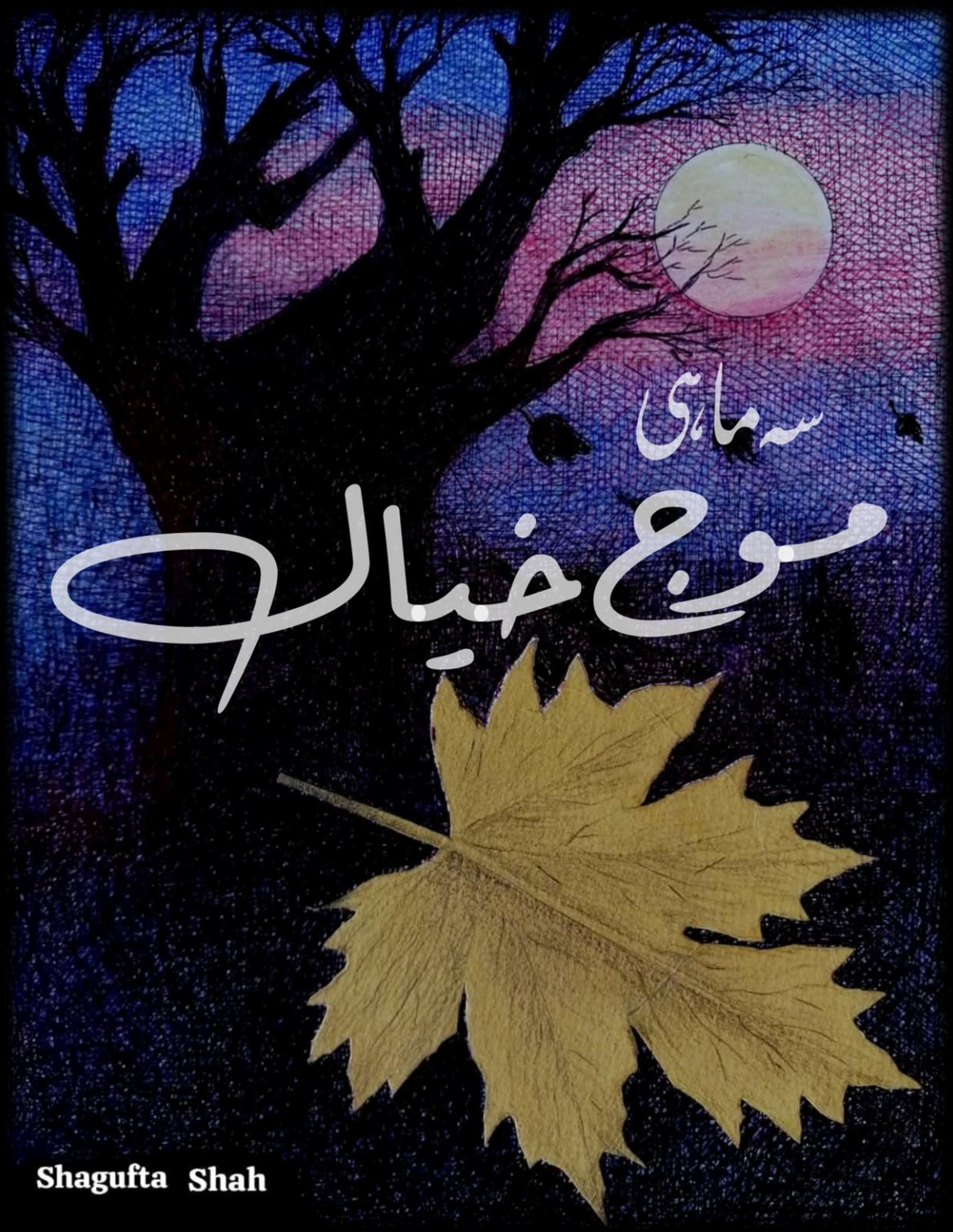
سہ ماہی
موجِ خیال
Shagufta Shah

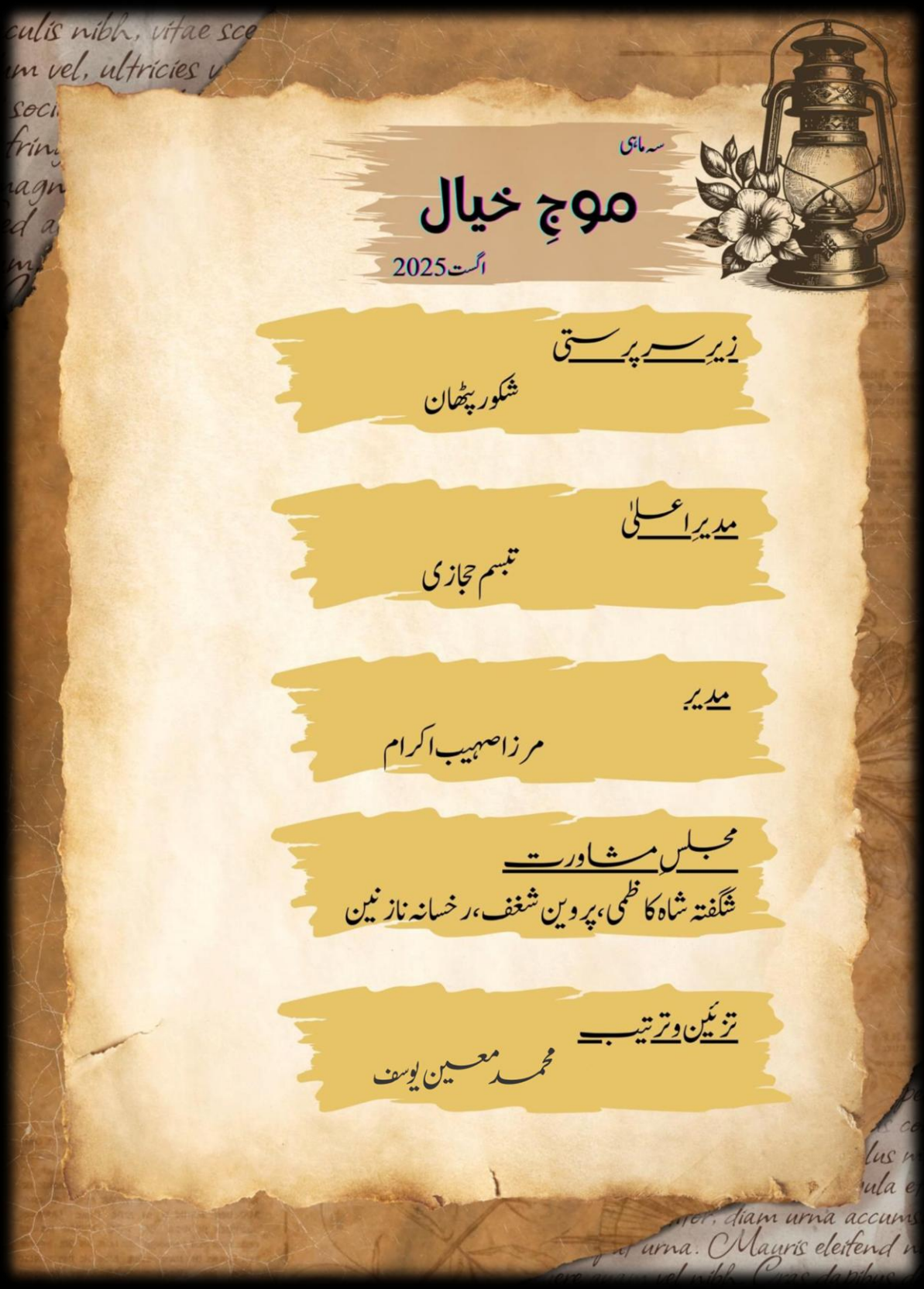
سہ ماہی
موجِ خیال
اگست 2025
زیرِ سرپرستی
شکور پٹھان
مدیرِ اعلیٰ
تبسم حجازی
مدیر
مرزا صہیب اکرام
مجلسِ مشاورت
شگفتہ شاہ کاظمی، پروین شغف، رخسانہ نازنین
تزئین و ترتیب
محمد معین یوسف

فہرست

❖ اداریہ

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار

❖ فلسفہ وجود و فنا — پروین شغف
❖ ام کلثوم — رخشندہ بخت
❖ یوم ثقافت (مہاجر) — ایمی علی
❖ سیاحت کیا ہے — باسط خان
❖ موٹی ویٹ — عبیرہ غوری خان

کتاب در کتاب

❖ عاطف توقیر کی نظم رد پر تبصرہ — ڈاکٹر سعدیہ بتول حیدر
❖ پکارتے ہیں راستے پر تبصرہ — حذیفہ ایوبی

شاعری سچ بولتی ہے

حمد ---نفیس ناندوروی — نعت ------ڈاکٹر رضوان الرضا رضوان

غزلیات

❖ پاپولر میٹھی
❖ پروین شغف—دہلی
❖ ڈاکٹر اسعد بدایونی
❖ تمنا جعفری
❖ ذیشان نیازی
❖ آرزو مہک۔ حیدر آباد

- شیرا جلالپوری
- عرفان صدیقی
- ذیشان مراد علیگ -رامپور، اترپردیش
- فرح شاہد -دوبئی
- انیس قلب بدایونی-بدایوں
- ڈاکٹر صبیحہ ناز حسین - غازی آباد
- نثار احمد نثار سرگودھا پاکستان
- مونیکا مستشا -دہرادون، اتراکھنڈ
- نور جمشید پوری
- حماد

نظمیں

- جگدیش پرکاش

باقی سب افسانے ہیں!

- کان — شاہین کمال
- کامیابی — مرزا صہیب اکرام
- دو مونہی — حمیرا ثاقب
- بھوک — غلام محمد اصغر
- سفر باطن — شبنم گل
- پاگل فقیرنی — پروین موسی
- کہانی نویس کی کہانی کے کردار سے لڑائی — شائستہ جمال

افسانچہ

- آدم خور — جاوید نہال حشمی
- انستھیزیا — جاوید نہال حشمی

- زلزلہ — شگفتہ شاہ
- ترقی — شگفتہ شاہ
- جنگ — شاہانہ جاوید
- مون سون — شاہانہ جاوید
- کسی کو بقا نہیں — ڈاکٹر سیدہ بدر فاطمہ

ان سے ملئے

- جاوید نہال حشمی — انٹرویو — مرزا صہیب اکرام

نگار خانہ

- دکھ، ریشم اور مٹھاس۔ — شکور پٹھان

عہد رفتہ سے جھلک

- اردو افسانہ نگاری میں پریم چند کا کردار — تبسم حجازی
- منتر — منشی پریم چند

اداریہ

اسلام علیکم!

اداریہ لکھنا وہ کام ہے جو سب سے مشکل مانا جاتا ہے۔ رسالے کی تعریف کر سکتے ہیں لیکن یہ کام مدیر کا نہیں ہوتا بلکہ قارئین کا ہے۔ تنقید کے نشتر چلا سکتے ہیں لیکن یہ کام نقاد اپنا ازلی حق سمجھتے ہیں۔ آج کل کے جدید دور میں کچھ خطرناک قسم کے عنوانات مضامین افسانوں اور کہانیوں کے ساتھ نتھی کر سکتے ہیں۔ اس سے بھی تجسس کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی ضرورت کیا ہے؟ آپ کا رسالہ ہے آپ کے سامنے ہے۔ اس سے قبل پہلے شمارے کا نتیجہ ہمارے لیے امتحان جیسا تھا جس میں ہم پاس ٹھہرے۔ قارئین کی معقول تعداد پہلے ہی شمارے سے ہمیں میسر آئی ہے۔ آئندہ شمارے میں کوشش ہوگی کہ معیار برقرار رکھیں تاکہ تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا رہے۔ اس بار بھی آپ کے لیے بہت سی دلچسپیاں لے آ کر آئے ہیں۔ اور ایک چھوٹی سی بات ہے کہ علم اپنی نسلوں کے حوالے کر کے جانا چاہیے وگرنہ گھروں سے ادب کوچ کر جاتا ہے۔ اردو ادب پہلے بھی کبھی کوچہ و بازار میں عام نہیں ہوا لیکن موجودہ قحط الرجال میں ہمیں اس خوبصورت زبان اور بیان کو بچانے اور بڑھانے کی کوشش میں اپنا حصہ ڈالنا چاہیے۔ تاکہ ادب عالیہ کی طرح عوامی ادب کہلانے والا ادب بھی قصوں کہانیوں میں نہ رہ جائے۔ آپ کا شمارہ آپ کے سامنے ہے۔ نقادوں سے بچیں۔ اس کا لطف لیں ستمبر کا تحفہ **دسمبر میں آپ کے پاس حاضر ہے**

"مرزا صہیب اکرام"

لگا
رہا
ہو ں
مضامین نو
کے پھر
انبار

قادرِ مطلق نے اپنی کائنات کی ہر شے کو اس کی مخصوص فطرت عطا کی ہے، اور اسی فطرت کے ذریعے اس کی ہئیت اور مقصد کا پتہ چلتا ہے، خواہ وہ چیز کتنی ہی چھوٹی ہو یا کتنی ہی بڑی۔ ہر شے اپنی فطرت کے مطابق اپنے وجود کا سفر طے کرتی ہے، بس اسے برتنے کا ہنر ہی اسے منفرد بناتا ہے۔

اس دارِ فانی میں صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مشاہدات اور تجربات کی صلاحیتوں سے نوازا ہے، مگر انسان اکثر ان حقوق کا غلط استعمال کرتے ہوئے قدرت کی کارسازی میں مداخلت کو اپنی ترقی اور کامیابی سمجھ بیٹھتا ہے۔

ذرا دیکھیں تو سہی، ننھی بوندیں بھی جانتی ہیں کہ ان کی زندگی اور جینے کا ہنر کیا ہے۔

آج آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ کالے بادل اپنے اپنے سفر پر نکل پڑے ہیں؛ کوئی بلند پربتوں کی طرف بڑھ رہا ہے، کوئی دشت و صحرا کا رخ کیے ہے؛ کوئی شہر کا رُخ کر رہا ہے اور کوئی باغ و چمن میں اترنے پر خوش ہے۔ بالآخر یہ بادل بارش میں ڈھلتے ہیں اور بارش بوندوں کی شکل میں برستی ہے۔

مسافت کے دوران دو بوندیں آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ ایک بوند دوسری کو ہمدردانہ نگاہ سے دیکھ رہی تھی جبکہ دوسری بوند خاموش اور مطمئن تھی۔ پہلی بوند بہت خوش تھی مگر بار بار حیران ہو رہی تھی کہ دوسری بوند اتنی خاموش اور پُرسکون کیوں ہے۔ وہ بار بار اپنی شفقت بھری نگاہ اس پر ڈالتی اور دوسری بوند بس مسکرا دیتی۔ یوں دونوں ایک دوسرے کو سفر کی دعائیں دینے لگیں۔ بالآخر پہلی بوند کی حیرانی اور تجسس بڑھا تو اس نے سوال کر ہی ڈالا:

"سنو"!

"ہمم؟"

"تم اتنی خاموش اور مطمئن کیسے ہو؟" "کیوں؟ کیا خاموش اور مطمئن ہونا کوئی غلط بات ہے؟"

"ارے نہیں نہیں، میں تو بس یوں ہی پوچھ رہی تھی۔" "اچھا، یہ بتاؤ تم اتنی خوش کیوں ہو؟ حالانکہ تمہیں خوش دیکھ کر مجھے بھی اچھا لگتا ہے۔"

پہلی بوند نے سوچا کہ جواب دوں یا نہ دوں، مگر خوشی سے سرشار ہونے کے باعث بے جھجک بول پڑی:

"ہاں، میں بہت خوش ہوں۔ آج ہم مسافت میں ہیں اور زمین کے جس خطے پر مجھے گرنا ہے وہ ایک ہرا بھرا جنگل ہے، جہاں میں کسی نرم شوخ پتی پر" یہ کہہ کر "گر کر شبنم اور نایاب موتی کی طرح چمکوں گی۔ لیکن سچ کہوں تو مجھے تمہارے لیے دکھ ہو رہا ہے، کیونکہ تم تو تپتے صحرا میں گرنے والی ہو۔

وہ مایوسی سے سر جھکا لیتی ہے۔

دوسری بوند نے نرمی سے کہا:

"ارے، تم اس قدر مایوس نہ ہو، یہی تو میرے اطمینان کی وجہ ہے۔"

"کیا؟ مطلب؟"

"دیکھو، ہم دشت میں گریں یا صحرا میں، یہ تو قسمت ہے۔ مگر یہ بتاؤ ہماری اصل فطرت کیا ہے؟"

"فطرت؟"

"ہاں، فطرت۔"

پہلی بوند نے خاموشی اختیار کی۔ دوسری بوند نے خود ہی کہا:

"ہماری فطرت ہے فنا ہونا، رائیگاں نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ میں جس صحرا میں گرنے والی ہوں وہ شدت سے میرا منتظر ہے، وہ پیاسا ہے۔ میرے انتظار میں ہر دن وہ سورج کو اپنی گود میں بھر لیتا ہے، پھر بھی آسمان سے امید لگائے بیٹھا ہے۔ جیسے ہی میں اس کی گود میں گرتی ہوں وہ مجھے خود میں سمو لیتا ہے، ایک بوند بھی ضائع نہیں ہونے دیتا۔ میرا وجود ہے ہی فنا ہونے کو۔ میں اس کی پیاس بجھاتے ہوئے فنا ہو جاؤں گی، نہ کہ رائیگاں۔ جبکہ تم کسی نرم پتی پر گر کر چمکو گی، مگر ہو سکتا ہے ہوا کا جھونکا تمہیں گرا دے یا دھوپ تمہیں پھر سے بھاپ میں بدل کر آسمان پر لوٹا دے۔ میرے نزدیک وجود کا دوسرا پہلو فنا ہونا ہے، اور یہی ہماری فطرت اور ہیئت ہے۔" یہ سن کر پہلی بوند افسردہ رہ گئی اور دوسری بوند الوداع کہتے ہوئے صحرا میں فنا ہو گئی۔

ام کلثوم مصری مغنیہ

رخشندہ بخت

ام کلثوم 30 دسمبر، 1898ء سلطنت عثمانیہ میں ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے باقاعدہ تعلیم نہیں پائی۔ 1954ء میں قاہرہ کے ڈاکٹر حسن الحفنی سے شادی ہوئی۔ مصری کہتے ہیں کہ اہرام مصر اور ام کلثوم کی آواز کو ثبات دوام حاصل ہے۔ عرب کلاسیکی موسیقی میں کافی مہارت حاصل کی۔ ان کی آواز تمام عرب علاقوں میں آج بھی مقبول ہے۔ انھیں کوکب الشرق (مشرق کا ستارہ) اور سیدۃ الغناء العربی (عرب موسیقی کی ملکہ) کہا جاتا ہے۔ بہت سے اعزازات ملے۔ سابق شاہ فاروق اول نے انھیں (ذیشان الکمال) الکمال کا اعزاز دیا۔ مصر کی حکومت نے ان کی آواز میں قرآن حکیم کو بھی ریکاڈ کیا۔ ان کی ایک عادت یہ تھی کہ ہمیشہ ان کے ہاتھ میں ایک رومال ہوتا تھا جسے وہ جوش گلوکاری میں لیر لیر کر دیتی تھیں۔ ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ گلوکاری کی۔

یہ جون 1967 کا قاہرہ ہے۔ موسیقی کی ایک محفل میں مصری گلوکارہ کے لہجے کا سوز اور کلام کی روح میں اترتی تاثیر حاضرین کو اشکبار کر دیتی ہے۔ خاتون گلوکار کی منتخب کردہ شاعری کے مضمون اور مصر کے اس دور کے حالات میں مطابقت نے محفل کے مزاج اور ماحول میں رقت آمیزی اور شکوہ کنائی شامل کر دی۔

اس مجلس میں نغمہ سرا کوئی اور نہیں بلکہ عرب موسیقی کی ملکہ کا خطاب رکھنے والی معروف مغنیہ ام کلثوم تھیں جن کی مدھر آواز کا سارا عرب دیوانہ تھا۔ ان کے گانے سامعین کو سرخوشی میں مبتلا کر دینے والے ہوتے تھے۔ مگر اس دن اس کے برعکس کیفیت کی ایک وجہ عرب اسرائیل جنگ کے نتیجے میں ابھرنے والے احساسات تھے، لیکن اسی کے ساتھ ہی ساتھ شاعر کے کلام کا غیر روایتی اور حسب حال ہونا بھی تھا۔۔۔۔

'میری آرزو ہے کہ میں نئی نسل کے لیے موسیقی کی دنیا میں ایک مثال بنوں'

'حدیث الروح' کے نام سے گایا جانے والا یہ کلام برصغیر کے معروف شاعر علامہ اقبال کی نظم شکوہ کا عربی ترجمہ تھا۔ خدا کے حضور مسلمانوں کی زبوں حالی کا یہ شکوہ اقبال نے لکھا تھا۔ مسلم قوم کی مشکلات کے درد بھرے نوحے کو ام کلثوم کی آواز دینے کے محرکات میں شاید جنگ میں ناکامی سے مضطرب دلوں پر الفاظ کا مرہم رکھنا تھا۔

اپنی آواز سے کروڑوں عربوں کے دلوں میں بسنے والی ام کلثوم نے علامہ اقبال کا کلام گا کر اسے عالم عرب سے متعارف کروایا۔ حکومت پاکستان نے اس کے اعتراف میں انہیں 18 نومبر 1967 کو ستارہ امتیاز دینے کا اعلان کیا جسے بعد میں قاہرہ میں پاکستانی سفیر نے ام کلثوم کو پیش کیا۔

اقبال کی معروف نظموں شکوہ اور جواب شکوہ کو مصر کے معروف شاعر صاوی علی الشعلان نے حدیث الروح کے نام سے عربی کا جامہ پہنایا۔ بینائی سے محروم یہ شاعر فارسی میں ایم اے کی ڈگری کے علاوہ اردو پر بھی کمال کی دسترس رکھتے تھے۔ ان سے قبل پاکستان میں مصر کے سابق سفیر عبدالوہاب عزام نے اقبال کے فارسی اور اردو کلام کو عربی میں منتقل کیا تھا۔ مگر ام کلثوم کی گائیکی نے اقبال کو عام عربوں سے متعارف کروایا۔

'مشرق کا ستارہ' کہلانے والی ام کلثوم کون تھیں؟

موسیقی میں عالم عرب کی پہچان اور 'کواکب الشرق' (مشرق کا ستارہ) کے خطاب کی حامل ام کلثوم دریائے نیل کے ڈیلٹا کے علاقے میں 1904 میں پیدا ہوئیں۔ والد مسجد کے مؤذن تھے جو ارد گرد کے علاقوں میں مذہبی کلام گایا کرتے تھے۔ اپنے اس کام میں مدد کے لیے وہ 12 سالہ بیٹی کو لڑکوں کے کپڑے پہنا کر ساتھ رکھتے تھے۔ ام کلثوم نے والد اور بھائی کو مخصوص کلام گاتے دیکھ کر اس کی نقالی شروع کردی۔ آواز میں کھنک اور ترنم پر عبور کی وجہ سے کلاسیکی موسیقی کی تربیت حاصل کی۔

قدرت نے ام کلثوم کو پرسوز گلا اور تاثیر سے بھرپور لہجہ عطا کیا تھا۔ اسی باعث 1923 میں وہ گائیکی کے لیے قاہرہ منتقل ہو گئیں۔ اوائل عمری میں آواز کی انفرادیت نے قاہرہ کی ثقافتی تقریبات میں گلوکاری کی راہ ہموار کردی۔

ام کلثوم کو گانے سے روکنے کے لیے ریڈیو سٹیشن پر حملہ

1934 میں قاہرہ میں ریڈیو سٹیشن کا بننا مصر میں ایک ثقافتی انقلاب کی شروعات تھا۔ محدود محفلوں میں اپنے فن کے جوہر دکھانے والی ام کلثوم کی آواز ریڈیو کے ذریعے لاکھوں سامعین تک جانے لگی۔ 1937 سے ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو موسیقی کا خصوصی پروگرام شروع ہوا۔

ام کلثوم اگلے تقریباً چالیس سال تک حاضرین کی موجودگی میں اس میوزک کنسرٹ میں گائیکی کا مظاہرہ کرتی رہیں۔ چالیس اور پچاس کی دہائیوں میں اس پروگرام کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ تیونس سے عراق تک اس کی نشریات کے دوران محلے اور گلیاں ویران ہو جاتے تھے۔ ان کا گانا سننے کے لیے لوگ اپنے گھر میں خصوصی تقاریب منعقد کرنے لگے۔ اس کنسرٹ کا ٹکٹ ملنا خوش نصیبی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اس بے پناہ مقبولیت کے باعث انہیں صوت العرب کا نام دیا گیا۔

1956 میں نہر سویز کے معاملے میں برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے مصر پر حملہ کر دیا۔ ام کلثوم کے گائے ہوئے قومی اور جنگی نغموں نے مصری قوم میں ایک ولولہ بیدار کر دیا۔ اس حوالے سے ملکہ ترنم نور جہاں اور ام کلثوم میں مماثلت پائی جاتی ہے کہ دونوں نے جنگ کے دوران اپنے لوگوں کے جذبوں کو مہمیز دینے کا کام کیا۔ ام کلثوم کے پرجوش نغموں کو خاموش کرنے کے لیے برطانوی طیاروں نے قاہرہ ریڈیو سٹیشن پر حملہ کیا۔ بمباری کی وجہ سے ام کلثوم کے جذبات بھرے گیت تین روز کے لیے بند ہو گئے تو ان کے لاکھوں سامعین مضطرب ہو گئے۔ متبادل جگہ سے جب ان کی آواز مصری قوم کی سماعتوں تک پہنچی تو ان کے جذبات کی گرمی لوٹ آئی۔

ہاتھ میں رومال کے ساتھ گائیکی

ام کلثوم نے اپنے دور کے نامور شاعروں کے کلام کو نغموں کا روپ دیا جن میں احمد رامی کی شاعری اور ام کلثوم لازم و ملزوم سمجھے جاتے تھے جنھوں نے ام کلثوم کے لیے 137 گیت لکھے۔ فارسی کے معروف شاعر عمر خیام کی رباعیوں کے عربی ترجمہ کی گائیکی کو بھی شہرت ملی۔

کلاسیکی موسیقی میں اپنی ابتدائی تربیت کے زیر اثر انہوں نے روایتی عربی موسیقی کو نیا آہنگ دیا۔ مگر ام کلثوم کی اصل شہرت عوامی زبان اور محاورے پر مبنی گیت بنے۔ روزمرہ بول چال کی زبان میں کی گئی رومانوی شاعری جب ام کلثوم کے پر سوز گلے سے نکلتی تو عرب کے صحرا اور کوہساروں میں بسنے والوں پر وجد طاری ہو جاتا۔ مصری شاعر بیرام التونسی کے عوامی انداز میں لکھے گیت سب سے زیادہ پسند کیے جاتے تھے۔

گلوکاری میں کلام کو ایک خاص طرز و انداز سے گایا جاتا ہے۔ ام کلثوم اس حوالے سے دنیا بھر میں ممتاز تھیں کہ وہ کوئی مصرع دوبارہ ایک ہی طرز میں نہیں گاتی تھیں، بلکہ ہر بار ان کا انداز اور ادائیگی کی طرز پہلے سے مختلف ہوتی۔ ان کی ایک اور انفرادیت گائیکی کے دوران ہاتھ میں رومال لہرا کر گانے کے بول ادا کرتی تھی۔

مصر کا چوتھا اہرام کیوں کہا جاتا تھا؟

ام کلثوم نے روایتی عربی اور مصری موسیقی کو جدید آہنگ اور قبولیت عام سے ہمکنار کیا۔ وہ عربی زبان کی پہلی گلوکارہ تھیں جنہوں نے جدید سازوں کو ایک خاص ترنم اور ترتیب میں استعمال کرنے کی طرح ڈالی۔ یورپین آرکسٹرا اپنے متنوع سازوں کی وجہ سے دنیا میں مقبول ہوا۔ ام کلثوم کے انداز گائیکی اور دھنوں کی مخصوص تشکیل گویا عربی موسیقی کا منفرد آرکسٹرا متعارف کروانا تھا۔

مصر کے تین اہرام تو پہلے ہی دنیا بھر میں مشہور ہیں اور اس کی ثقافتی اور تہذیبی علامات کے سب سے بڑے نمائندہ ہیں۔ اسی طرح مصر کی ثقافتی اور فنی زندگی میں ام کلثوم کی آواز ثقافتی ورثے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی نسبت سے انہیں مصر کا چوتھا اہرام بھی قرار دیا جاتا ہے۔

جمال عبدالناصر نے ام کلثوم کے گانے کیوں بحال کروائے؟

قاہرہ ریڈیو نے ام کلثوم کی شہرت اور فن کی معراج کو مصر سے باہر بھی متعارف کروایا۔ 1944 میں مصر کے بادشاہ فاروق نے انہیں ' شان الکمال ' ایوارڈ عطا کیا۔ مگر کسی وجہ سے شاہی خاندان ان سے شاکی رہنے لگا۔ 52 میں جمال عبدالناصر کے برسر اقتدار آنے کے بعد ان کی حکومت کے کچھ اہلکاروں نے ام کلثوم کے شاہی خاندان سے تعلقات کی وجہ سے ریڈیو پر ان کا گانا نشر ہونے سے روک دیا۔

جب جمال عبدالناصر کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ متعلقہ حکام کو یہ کہتے ہوئے ان کا پروگرام بحال کرنے کی ہدایت کی کیا وہ چاہتے ہیں کہ مصر کے عوام اس وجہ سے میرے خلاف ہو جائیں۔ ام کلثوم کا جمال عبدالناصر سے قریبی تعلق قائم ہو گیا تھا۔ اسی لیے انہوں نے ناصر کی حکومت کے لیے بہت سارے عسکری اور ملی نغمے گائے۔ 1966 کی جنگ کے دوران ایک خطیر رقم حکومت کو بطور عطیہ پیش کی۔

عالم عرب کی ثقافتی سفیر

عرب موسیقی کی وسعتوں اور معنویت کو جب ام کلثوم کی آواز ملی تو اس کی اثر پذیری کئی گنا بڑھ گئی۔ اسی نسبت سے وہ عرب کی ثقافتی سفیر کہلاتی تھیں۔ مصری حکومت نے باقاعدہ انہیں سفیر کا درجہ اور سفارتی پاسپورٹ دے رکھا تھا۔

ام کلثوم جب گلے میں تکلیف کے علاج کے لیے امریکا گئیں تو انہیں غیر معمولی توجہ اور احترام ملا۔ ان کے ڈاکٹروں کو آپریشن میں احتیاط اور مہارت کا مظاہرہ کرنے کی تلقین کرتے ہوئے بتایا گیا کہ اس آپریشن پر عربوں اور امریکا کے تعلقات کا انحصار ہے۔ اگر ام کلثوم کا گلا ٹھیک نہ ہوا تو عرب عوام کی ناراضی یقینی ہو جائے گی۔

وفات کی جھوٹی خبر

پاکستان میں گزشتہ کچھ عرصے سے معروف فنکاروں اور مشہور ملکی شخصیات کے انتقال کی جھوٹی خبریں گردش کرتی رہتی ہیں۔ یہی کچھ ام کلثوم کے ساتھ بھی ہوا۔ 1975 میں ام کلثوم جب عارضے کے باعث ہسپتال میں داخل تھیں تو ریڈیو اور اخبارات میں ان کے انتقال کی جھوٹی خبر چل گئی۔ جس کا مصری وزیر اعظم نے سخت نوٹس لیتے ہوئے ایک خصوصی انکوائری کروائی۔

جنازہ کے لیے خصوصی پروازیں

تین فروری 1975 کو جب ام کلثوم کا انتقال ہوا تو ریڈیو قاہرہ نے معمول کی نشریات معطل کر دیں۔ ماتمی نغمے نشر کر کے ان کے بچھڑنے کا غم منایا گیا۔ اس دور کے اخبارات کے مطابق ان کے جنازے میں چالیس لاکھ کے قریب لوگوں نے شرکت کی۔ دنیا بھر سے ان کے مداح اتنی بڑی تعداد میں قاہرہ پہنچنے لگے کہ فضائی کمپنیوں کو اس موقع کے لیے خصوصی فضائی سروس شروع کرنی پڑی۔

تقریباً نصف صدی تک اپنی آواز کا جادو جگانے والی ام کلثوم کے گائے گیت آج بھی عرب ملکوں کے گھروں، قہوہ خانوں اور گاڑیوں میں ان کی یاد دلاتے ہیں۔ اکتوبر 2017 میں سعودی ٹیلی ویژن الثقافیہ نے ام کلثوم کے مشہور گانوں کے کنسرٹ نشر کیے۔ مصر نے 2011 میں اپنی عظیم گلوکارہ کی یاد میں خصوصی میوزیم قائم کیا جس میں ام کلثوم کی ذاتی اشیاء محفوظ کی گئی ہیں۔ جس سے وہ مخصوص انداز میں سر اور ساز کے ساتھ لہرا کر گانے کے بول ادا کرتی تھی۔

حوالہ جات!

ویکیپیڈیا

اردو نیوز

ریختہ

پنجاب کے مشہور شہر سے دوست کی کال آئی کہنے لگا 24 دسمبر ہے ثقافت کا دن مبارک اور سنا کیا حال ہیں تیرے لئے سیدی جون کا شعر ہے یہ سندھی اور مہاجر ہڈ حرام

کیوں نہیں یہ بیچتے ترکاریاں

شعر سنتے ہی میرے منہ سے بے اختیار نکلا اوبھ۔۔۔۔۔بہت مشکل سے خود کو روکا لیکن میری آدھی بات پوری پہنچ چکی تھی۔وہ چلایا مجھے کیوں کہہ رہا ہے صد فیصد مہاجر کا شعر ہے تجھے سنانے کے لئے کل سے رُکا ہوا تھا۔۔میں نے کہا دیکھ تو پنجاب کے جس شہر سے ہے اسے ہم جس نام سے یہاں پکارتے ہیں میں لکھ کر ثقافت کے دن کو گناہ میں نہیں ڈالنا چاہ رہا۔۔

چھوڑ ناراض کیوں ہوتا ہے بس یہ سوچ کہ منہ میں گٹکہ وماوا بھرا ہوا ہو اور مہاجر آواز لگانا چاہ رہا ہو گا منہ اوپر کر کے آلو لے لو، توری لے لو۔

گٹکے، ماوے کی وجہ سے ہر وقت منہ اوپر رہے گا اور سبزی نیچ و نیچ بک جانی ہے۔یار تو اب زیادتی کر رہا ہے۔

ارے ناراض نہ ہو میں نے تھوڑی جون کی فرمائش ہے۔

ہونگے یار اپنی کسی ترنگ میں ان کی جب ہٹی ہوتی ہے تو وہ شیعہ مُلا نہیں چھوڑتے، جانے دے بات کوئی اور ہو گی۔

بات آئی گئی ہو گئی۔۔مگر میں سوچتا رہا کہ یار عجیب بات ہے قوموں کی پہچان ان کا لباس، زبان، ادب آداب، لہجہ ہوتا ہے اور مہاجروں کی پہچان دیگر قوموں میں محض گٹکہ وماوا ہو کر رہ گئی ہے۔

اک دوست کہتا ہے یار اس گٹکے، ماوے سے پہلے پان ہوا کرتا تھا ہم پان جیسی بہترین تہذیب کو منتقل نہیں کر سکے، تو اس کی جگہ گٹکے وماوے نے لے لی۔اب فضا ایسی بن چکی ہے کہ اس سے انکار کیسے کریں چاروں طرف لاکھوں کیبن اور ان پہ بکتا رجسٹرڈ و نان رجسٹرڈ گٹکا، ماوا، سوکھا و گیلا کروڑوں روپے کی روزانہ کی معیشت بن چکا ہے کیسے انکار کریں اس سے۔

اس پریشانی میں فیصل کو فون کیا وہ ناظم آباد کے اطراف رہتا ہے سو وقت طے کر کے اس کے پاس پہنچا اور قریبی ہوٹل میں چائے کے لئے بیٹھ گئے۔کافی لوگ تھے میں نے نوٹ کیا کہ کافی سارے لوگ ہر تھوڑی دیر کے بعد منہ اوپر کرتے ہیں پھر انتہائی ادب سے منہ نیچے کرتے ہیں، فیصل یہ کیا ہے!؟ تو اس نے بتایا کہ یہ حضرات گٹکا وماوا نوش فرما رہے ہیں اور پیک (گٹکا وماوی کا وہ عرق جو تھوک کی آمیزش سے اک دلفریب مشروب بن جاتا ہے) اسے بچا رہے ہیں۔

میں نے سب کو سلام کیا اور اپنا سوال رکھا تو اک صاحب کشف نے اشارے سے کچھ کہا سب سمجھ گئے کہ وہ پیکنا چاہ رہے ہیں۔۔۔ فیصل نے فوراً کہا لے بھئی ایمی وہ بات جو پیک پھینک کر کی جائے اس سے اہم بات کوئی نہیں ہو سکتی تیرا جواب آنے کو ہی ہے۔ میں بہت متجسس ہوا تو صاحب کشف نے کہا کہ ابے کیا ہو گیا ماوی کا ذکر تو قرآن میں آیا ہے تم نے نہیں پڑھا جنت الماویٰ۔۔

یہ سن کر تو میرے منہ سے گرم چائے فوارے کی طرح نکل پڑی۔۔ میں نے فوراً آگے بڑھ کر اس عظیم المرتبت شخص کے ہاتھوں کا بوسہ لیا اور بڑی ہمت سے کہا قبلہ کیا کہنے۔۔۔۔۔ وہ دوسرا گٹکا منہ میں رکھ چکے تھے اسلئے جواب میں صرف ہمم کہا یعنی مزید گٹکا ضائع نہیں کر سکتے اور پیک بنانے میں مصروف عمل ہو گئے۔ فیصل۔۔ یہ جواب تھا۔۔؟ یا نیا کٹا۔۔؟

خیر میں نے ان تمام احباب سے کہا کہ دیکھئے یہ مسئلہ گھمبیر ہوتا جا رہا ہے اس بابت کچھ سوچئے تہذیب کو، کسی طرح بچایئے اپنے علاقوں سے اس کا بائیکاٹ کیجیے۔۔ سب مجھے بھرے منہ سے گھورتے رہے اور زیرِ لب پیک رینگتی ہوئی باہر کو آنے لگی۔۔۔ اسی اثناء میں اک صاحب عمامہ پہنے داخل ہوئے فیصل نے کہا اس سے پوچھ۔۔!

میں نے مدعا عرض کیا تو کہنے لگے میٹھے میٹھے بھائی (مجھے لگا انہوں نے مجھ پہ چیونٹیاں چڑھتی ہوئی دیکھ لیں) چپ رہنا خدا کی نعمت ہے انسان فضول گوئی سے محفوظ رہتا ہے اور فضول گوئی سے پیدا ہونے والے گناہوں سے دور اور ثواب کے قریب رہتا ہے۔ فوراً جیب سے کتابچہ نکالا چُپ کے 100 مدنی پھول، مجھے تھمایا اور پھر دوسرے جیب سے گٹکا نکال کر کھایا اور چپ تھیر اپی کی طرف گامزن ہو گئے۔

میں نے فیصل سے کہا یار کیا واقعی گٹکے، ماوے کی وجہ سے ہم اس چُپ کی نیکی حاصل کر رہے ہیں، سگریٹ سلگا کر کہنے لگا دیکھ یار سگریٹ سے تو یہ ممکن نہیں، اسلئے اس بات کو مان لیتے ہیں۔۔ پھر کہنے لگا دور کے ماموں ہیں انکے ساتھ مسجد میں تھا جمعہ کی نماز میں تو ماموں نے اک کاغذ پہ لکھ کر دیا کہ فیصل جب امام صاحب بیان کے لئے آئیں تو بتا دینا میں نے اسی کاغذ پہ لکھا کیوں؟ لکھنے لگے کہ گٹکا پیکنا ہے نعرہء رسالت اہتمام سے لگتا ہے۔۔ یا اللہ۔۔۔ کس قسم کے گٹکے تھے وہ!! یار ماموں کو کچھ نہ کہہ بہت اللہ والے تھے۔۔ ماوا کو باقاعدہ جنت الماوی سمجھ کر کھاتے تھے اور ہمیشہ ماویٰ سورہ نجم کی آیت نمبر 15 پڑھ کر کھاتے تھے۔۔ کون لوگ ہو یار۔۔۔ میں چلتا ہوں۔۔ بائیک اسٹارٹ کی اور اسی فکر میں سوچتا ہوا راستے ماپتا رہا، ذہن بوجھل تھا گھر آتے ہی سو گیا فجر میں اٹھا،، نماز کے بعد طاق عدد میں قریبی کیبن سے گٹکے و ماوے لئے نیاز دی اور بانٹنے کو اٹھ ہی رہا تھا کہ امام صاحب و موذن صاحبنے کہا بسم اللہ، ماشاءاللہ۔۔۔ اور پھر پتا ہی نہیں چلا نیاز بٹ گئی۔۔۔ آج 24 دسمبر ہے مہاجروں کا ثقافتی دن ہے میں پینٹ شرٹ پہنے سڑک پہ چلتے پھرتے لوگوں میں احترام کے ساتھ گٹکہ و ماوا بانٹ رہا ہوں، ذہن میں بار بار وہ ماموں یاد آ رہے ہیں، اور سورہ نجم۔

کہیں پڑھا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ وفادار موٹاپا ہوتا ہے ایک بار آجائے تو جان نہیں چھوڑتا۔

خود پر بیتی تو یہ قول سو فیصد درست معلوم ہوا۔۔۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ میری پیدائش سے پہلے میری ایک بہن پیدا ہو کر فوت ہو گئی تھی جسے یاد کر کے والدہ بہت روتی تھیں تو ان کی آہ و بکا دیکھ کر شائد اللہ تعالیٰ نے اس بیچاری کا وجود بھی دوبارہ مجھ میں سمو کر مجھے دنیا میں بھیج دیا۔اور پھر گول گپہ، لڈو، جاپانی گڑیا جیسے پیارے القابات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹن ٹن، موٹی بھینس، روڈ رولر جیسے طعنوں میں کب بدلے پتہ ہی نہیں چلا۔۔۔میں نے کبھی اپنے موٹاپے کو سنجیدگی سے نہیں لیا بھئی کھاتے پیتے گھر کی ہونے کی دلیل تھی یہ۔۔۔یونہی چکنا گھڑا بن کر طعنے سنتے ہوئے وقت گزرتا رہا اور پھر ایک حادثہ ہو گیا۔جب فن لینڈ میں اپنے پسندیدہ جھولے پر بیٹھنے لگی تو مالک نے یہ کہتے ہوئے منع کر دیا کہ آپ کا وزن زیادہ ہے آپ نہ بیٹھیں۔

یہ الفاظ الفاظ نہیں گویا زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے جو سیدھے میرے موٹے سے دل کے پار ہو گئے وہیں عہد کر لیا کہ اب میں بھی وزن کم کروں گی۔سب سے پہلے ٹوٹکوں کی باری آئی جن میں سر فہرست تھا نیم گرم پانی میں لیموں اور شہد۔۔۔کچھ عرصہ استعمال کے بعد الحمدللہ دو کلو لیموں اور ایک کلو شہد صاف ہو گیا مگر وزن ٹس سے مس نہیں ہوا۔پھر کسی نے کہا صرف ابلے ہوئے انڈوں سے ڈائٹ کرو اس سے تو ماشاءاللہ تین چار دن میں ہی اتنا فرق نظر آیا کہ بس منہ پر موٹے موٹے انڈے (دانے) نکل آئے۔توبہ کرتے ہوئے سوچا کہ چلو کچھ کھاؤں گی ہی نہیں مطلب فاقہ کر کے دیکھتی ہوں ایک وقت کا ہی فاقہ کیا تھا کہ معدے نے ہاتھ جوڑ کر دہائیاں دینا شروع کر دیں کہ بہن میرا کیا قصور ہے؟۔

ویسے بھی مجھ جیسی مخلوق ڈائٹ کی نیت سے صبح کا کھانا چھوڑ بھی دے تو شام کو الحمدللہ پانچ وقت کا کھانا اکٹھا کھا لیتی ہے۔

ڈائٹ گئی بھاڑ میں۔یہ بھی سنا کہ میٹھا چھوڑنے سے وزن کم ہو گا میں نے سوچا پہلے ہی اتنی کڑوی کسیلی زندگی اس مصنوعی میٹھے کے آسرے پر گزر رہی ہے یہ بھی چھوڑ دیا تو زندہ کیسے رہیں گے بھئی۔؟

رہی گرین ٹی تو اس کے متعلق مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ وہ صرف اسی صورت میں فائدہ دیتی ہے جب آپ اس کی پتیاں توڑنے خود پہاڑوں پر جائیں باقی سب سنی سنائی باتیں ہیں۔پھر ٹوٹکوں اور ڈائٹ کے ناکام تجربوں سے مایوس ہو کر پہلی فرصت میں جم پہنچ گئی ۔

وہاں سے بھی ڈائٹ پلان ملا جس کا گھر واپسی پر میں نے جہاز بنا کر اڑا دیا بھئی میں تین وقت کھانا دو وقت چائے کا مگ چائے کے ساتھ بسکٹ نمکو چپس اور آگے پیچھے بھوک لگنے پر باہر سے آرڈر اس کے علاوہ کھاتی ہی کیا تھی جو ڈائٹ کرتی خیر دو تین دن خوب جوش دکھایا اتنا کہ ایک دن جم جاتے ہوئے پاؤں مڑ گیا اور ٹخنے کی ہڈی میں بال آ گیا۔یوں میں جم پہنچنے کی بجائے ہاسپٹل پہنچ گئی۔

جم جانے کی جو موٹیویشن تھی اس میں سے موٹی ہی موٹی (میں) بچی بس۔

ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا جم سے پھر بھی میں" گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں "گنگناتی ہوئی دو تین ماہ بعد دوبارہ جم پہنچ گئی اس بار ذرا سنجیدہ تھی اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ جم کی خواتین ورک آؤٹ کے لئے جم انسٹرکٹر کو چھوڑ کر مجھے فالو کرتی تھیں بارہ چودہ کلو وزن کم کرنے کی خوشیاں ابھی ڈھنگ سے منائی بھی نہیں تھیں کہ ریڑھ کی ہڈی پر لگنے والی چوٹ نے پھر گھر بٹھا دیا۔

اور پھر کوشش کے باوجود دوبارہ جم نہیں جا سکی اگر جم میں رکھی مشینوں کی زبان ہوتی تو وہ شائد مجھ سے ایک ہی بات کہتیں کہ " رہنے دو بہن تم سے نہ ہو پائے گا". اب تو بس آئینہ دیکھ کر عبرت ہوتی ہے جہاں موٹاپا ہمیں منہ چڑاتے ہوئے کہہ رہا ہوتا ہے

یہ دوستی ہم نہیں توڑیں گے

چھوڑیں گے دم مگر

تیرا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔

سیاحت خدا سے ملنے کا نام ہے۔

سیاحت خدا کو دیکھنے کا نام ہے۔

سیاحت خدا کی خوبصورتی کو محسوس کرنے کا نام ہے۔

یہ خدا کی قدرت پر ایمان کو تازہ کرنے کا نام ہے—جہاں خدا آپ سے مناظرِ فطرت کی زبان میں بات کرتا ہے۔

اللہ نے تو پوری کائنات بنائی ہے، لیکن جب ہم خاص طور پر ان قدرتی علاقوں کی بات کرتے ہیں جہاں انسان کی مداخلت کم اور قدرتی حسن زیادہ ہو، تو انہیں قدرتی مقامات کہا جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے 1997 کا وہ لمحہ جب والدین عمرے پر جا رہے تھے اور میں شمالی علاقہ جات کے سفر پر نکل رہا تھا۔ میں نے ہنستے ہوئے والد صاحب سے کہا تھا:

" آپ بھی میرے ساتھ چلیں، میں بھی تو اللہ کو دیکھنے جا رہا ہوں، اللہ سے ملنے جا رہا ہوں۔"

میرا ذاتی خیال ہے کہ انسان جتنا خدا کو کسی قدرتی مقام پر یاد کرتا ہے اتنا کہیں اور نہیں۔ جب قدرتی منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے" : سبحان اللہ، الحمد للہ"!

کیونکہ قدرت نے زمین کے چپے چپے پر اپنے منفرد رنگ بکھیرے ہیں۔

لغوی اعتبار سے سیاحت کا مطلب ہے زمین پر چلنا، پھرنا، دیکھنا اور دریافت کرنا۔

لیکن آج کے دور میں شہروں کی مشینی زندگی نے ہمیں قید کر دیا ہے۔ چہرے پر رسمی مسکراہٹ ہے مگر دل کے اندر اداسی چھپی ہوئی ہے۔ خوشی کے لمحے مصنوعی ہو کر صرف موبائل اسکرین تک محدود رہ گئے ہیں۔ ایسے میں سیاحت ایک نعمت ہے—یہ روح کو ہلکا کرتی ہے، ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتی ہے، دکھ درد بھلا دیتی ہے اور وجود کو تازگی بخش دیتی ہے۔

جب آپ کسی آبشار کے سامنے کھڑے ہو کر پانی کے گرنے کی آواز سنتے ہیں تو دل کی تھکن اتر جاتی ہے۔ ایک آبشار کا شور، ایک جھیل کا سکون، یا ایک پہاڑ کی عظمت... یہ سب انسان کے اندر نئی زندگی بھر دیتے ہیں۔

پہاڑوں کی چوٹیوں سے بادلوں کو چھوتے دیکھنا، جنگل کی خاموشی میں پرندوں کی آواز سننا، دریا کے بہاؤ کو محسوس کرنا—یہ سب اس بات کی گواہی ہیں کہ کائنات میں ہر چیز ایک عظیم خالق کی صناعی ہے۔

قدرتی مناظر خود ایک شاہکار ہیں، لیکن یہ فنونِ لطیفہ کو بھی نئی جان بخشتے ہیں۔ قدرتی ماحول میں شاعری زیادہ گہری محسوس ہوتی ہے، موسیقی زیادہ دلکش لگتی ہے، کتاب زیادہ قریب محسوس ہوتی ہے اور مصوری رنگوں سے بھر جاتی ہے۔ یوں فن اور فطرت مل کر ایک نیا جہان تخلیق کرتے ہیں۔

"پاکستان کو خدا نے زمین پر جنت کے مناظر عطا کیے ہیں۔ شمالی علاقہ جات میں فلک بوس برف پوش پہاڑ، دریا، نیلی جھیلیں، شفاف ندیاں، جنگلات، سرسبز چراگاہیں، وادیاں اور بہتی آبشاریں دل کو مسحور کر دیتی ہیں۔ ان قدرتی نظاروں کے ساتھ منفرد ثقافت، قدیم قلعے اور تاریخی عمارتیں اس سرزمین کو اور بھی دلکش بنا دیتے ہیں۔ یہاں کا ہر منظر انسان کو خدا کی قدرت کی یاد دلاتا ہے۔

سیاحت نا صرف خوشی دیتی ہے بلکہ بیماریوں سے بچاتی ہے، ذہنی دباؤ کم کرتی ہے، انسان کو تازہ دم کرتی ہے اور روحانی سکون عطا کرتی ہے۔

" سیاحت ایک عبادت ہے، اگر دل سے کی جائے۔"

اور یہ عبادت تب مکمل ہوتی ہے جب آنکھیں دیکھتی ہیں، دل حمد کرتا ہے اور زبان دعا کرتی ہے۔

سیاحت صرف قدرتی مناظر دیکھنے کا نام نہیں بلکہ یہ انسان کو اپنے باطن کی طرف بھی لے جاتی ہے۔ راستوں کی تنہائی اور فطرت کی خاموشی میں انسان کو اپنے رب اور اپنی ذات دونوں زیادہ قریب محسوس ہوتے ہیں۔"

سیاحت نئی تہذیبوں اور نئے لوگوں کو سمجھنے کا موقع بھی ہے۔ مختلف شہروں اور ملکوں کے سفر سے ہمیں ان کی زبان، کھانے، رہن سہن اور روایات سے واقفیت ملتی ہے۔ یوں سیاحت دل کو سکون اور دماغ کو علم دونوں عطا کرتی ہے۔

شاعری اور گیتوں میں بھی سفر اور سیاحت کو ہمیشہ ایک خاص مقام دیا گیا ہے۔ بہت سے نغمے ایسے ہیں جو راستوں کی خوشبو اور مناظر کی دلکشی کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان گیتوں نے سفر کو صرف ایک ضرورت نہیں بلکہ ایک جذبہ اور رومانوی تجربہ بنا دیا۔

کچھ مشہور گانے

"سہانا سفر اور یہ موسم حسیں "

"یہ موسم یہ مست نظارے"

"پربتوں کے پیڑوں پر شام کا بسیرا ہے"

یہ وادیاں یہ فضائیں بلا رہی ہیں "تمہیں"

فلم سازوں نے ہمیشہ سیاحت کو پروموٹ کیا ہے۔ بڑے پردے پر دکھائے گئے قدرتی مناظر نے نہ صرف ان جگہوں کو دنیا کے سامنے متعارف کروایا بلکہ فلموں کو بھی نیا رنگ بخشا۔

چند مشہور فلمیں جو قدرتی مقامات پر فلمائی گئیں:

Cast Away (2000)

Alaska (1996)

The Edge (1997) – Anthony Hopkins

Fly Away Home (1996)

Into the Wild (2007)

The Lost City of Z (2016)

ThePostman (1997)

آخر میں بس اتنا کہوں گا کہ اپنے دل سے یہ عہد باندھیں کہ کہیں نہ کہیں ضرور جائیں گے۔ چاہے اپنے شہر کی پرانی گلی ہو، کوئی باغ ہو یا کوئی پہاڑی سلسلہ — لیکن عادت یہ بنالیں کہ گھومنے ضرور جائیں، قدرت سے ملنے ضرور جائیں۔

یہ بات میں اپنے تجربے سے کہہ رہا ہوں۔ میری سیاحت کی داستان عام نہیں تھی۔ نہ میرے پاس وسائل کی فراوانی تھی، نہ جسمانی اہلیت جس پر فخر کیا جا سکے۔ مگر والد کی دعاؤں نے میری زندگی کے راستے ایسے روشن کیے کہ قدرت کے در و دیوار مجھ پر کھلنے لگے۔

میں نے پاکستان کا ایک ایک گوشہ دیکھا، سرحد پار انڈیا گیا، خانہ کعبہ کا طواف کیا، لاکھوں کے ہجوم میں حجرِ اسود کو چومنے کا موقع پایا، سویڈن کی فضاؤں میں چھ ماہ گزارے اور آج بھی سفر جاری ہے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ سب محض اللہ کی عطا اور والدین کی دعاؤں کی بدولت ہے۔ میرے ہر سفر میں ان کی محبتیں اور خواہشیں میرے ہمسفر رہیں — اور یہی دعائیں آج بھی میرا سب سے قیمتی زادِ راہ ہے۔

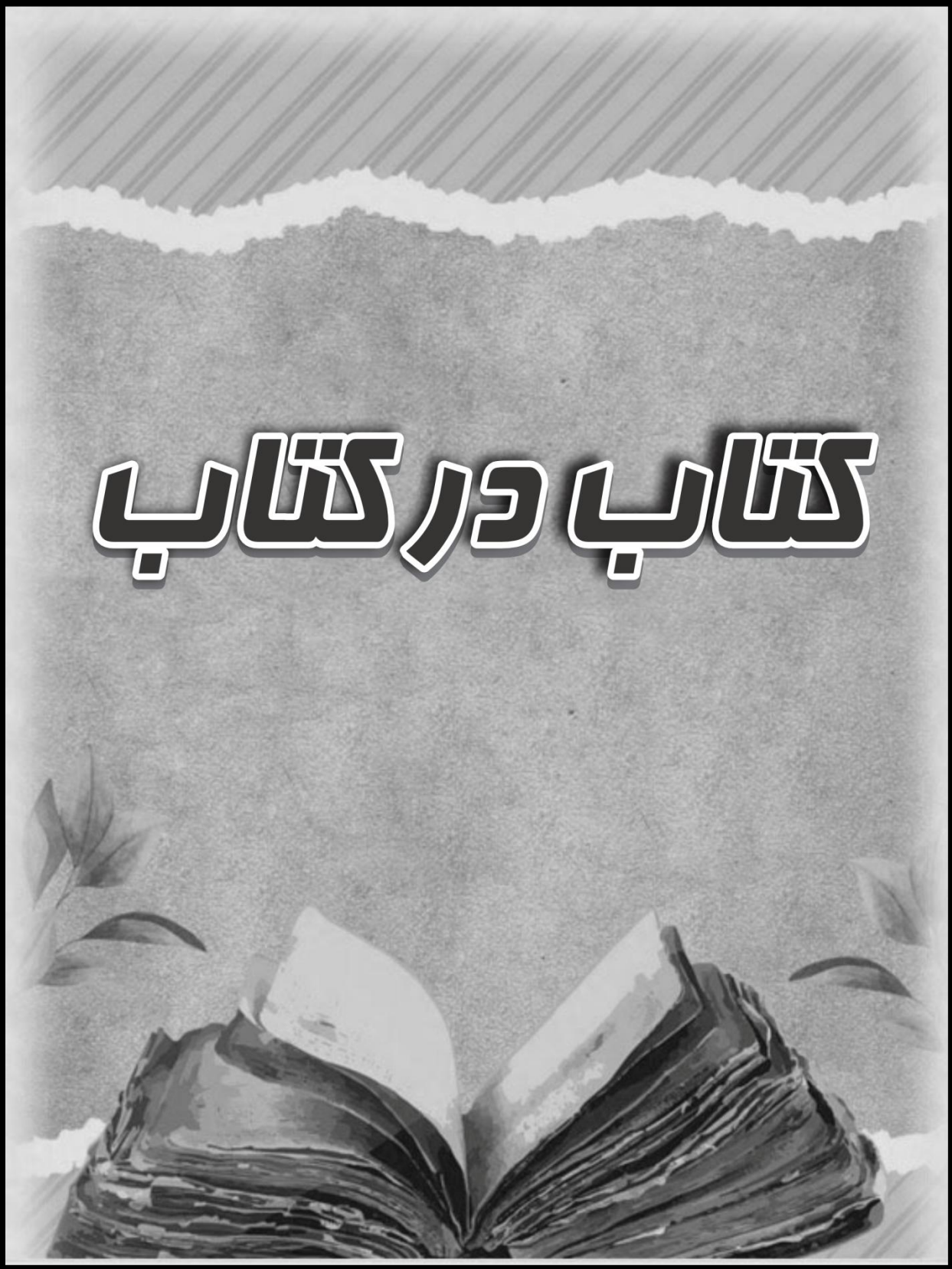
کتاب در کتاب

ایس ایم حسینی کا سفر نامہ " پکارتے ہیں راستے " پچھلے دنوں زیر مطالعہ رہا۔ یہ محض شہروں، علاقوں اور مختلف خطوں کے مشاہدے کی داستان نہیں، قلم کار کے خون جگر، نقطہ نظر اور باریک بینی کا عکاس ہے۔ قلم کار نے کتاب میں جا بہ جا اپنے احساسات قلب اور دقت نظری کے نمونے بکھیرے ہیں۔ قلم کار کسی شہر کو محض دیکھتا نہیں ٹٹولتا ہے؛ برتتا نہیں محسوس کرتا ہے، نہ صرف یہ کہ راہوں سے گزرتے ہوئے ان کے طول و عرض کی پیائش اور جزئیات پر نگاہ رکھتا ہے بلکہ ان کے تاریخی پس منظر اور تہذیب و ثقافت کو ساتھ لیکر چلتا ہے۔ جسے آپ ذوق، حافظے اور مطالعہ کا کمال کہہ سکتے۔ ایک نمونہ ملاحظہ کیجئے :

"ہمایوں کے مقبرے کے نچلے حصے میں چار زینے ہیں۔ مقبرہ طے کرنے کے بعد انیس چھوٹے دروازے اور وسط میں لکڑی کا ایک بڑا دروازہ ہے۔ بڑے دروازے سے پچیس سیڑھیاں اوپر حصے میں لے جاتی ہیں، اور اوپر پہنچتے ہی سامنے آٹھ در ہیں جبکہ داخل ہونے کے لیے دائیں جانب ایک بڑا دروازہ ہے۔

اس سفر نامے سے فارغ ہوں گے تو مصنف کا قلم چوڑیوں کے لیے مشہور فیروز آباد اور تاج نگری آگرہ کے طرف بڑھتا ہے جس کو " قبریں بولتی ہیں " کا نہایت دلکش عنوان دیا ہے۔

اس میں فیروز آباد کی چوڑیوں کی رنگا رنگی اور محبت کی لازوال نشانی" تاج محل " کے حسن کو کسی مصور کی طرح نہایت دلآویزی کے ساتھ کینوس پر اتار دیا ہے۔

تیسرے سفر نامہ " چار شہر چار مسافر "کو دریا بکوزہ کا حقیقی مصداق قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا، چار شہروں (جھانسی، ناگپور، ناندیڑ اور حیدر آباد) کی اہم اور ضروری معلومات کو محض پچاس صفحات میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس طور پیش کیا ہے کہ جس کو ہم قلم کار کے مرتب ذہن، حسن نظر، سلیس اور رواں قلم کا بہترین عکس بھی کہہ سکتے ہیں۔

دوران مطالعہ جو چند چیزیں میرے ذہن میں آئیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جن سفر ناموں میں مختلف مقامات کی روداد کو ایک عنوان کے تحت سمیٹا ہے اگر ہر شہر کو ایک ذیلی عنوان دیدیا جائے تو قاری کے لیے مطالعہ مزید سہل اور آسان ہو جائے۔

اسی طرح اس سفر نامے کے صفحہ ۱۲۴ میں غیر شعوری طور پر کرتے ہوئے، دیکھتے ہوئے کی تکرار در آئی ہے جس کو اگر تنوع کے ساتھ لکھا جاتا تو تحریر کی روانی اور حسن میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

کوہساروں اور آبشاروں سے لدے پھندے شہر نینی تال کا سفر نامہ بعنوان لمحوں میں بدلتے منظر "میری خصوصی دلچسپی کا باعث رہا وجہ آپ کے سامنے ہے " : بادلوں سے چھن کر سرسبز کوہساروں پر پڑنے والی دھوپ الگ ہی سماں پیدا کر رہی تھی۔ یوپی کی دھوپ جان لیوا ہوا کرتی ہے لیکن

یہاں کی دھوپ میں تمازت کا عنصر نہ کے برابر تھا، سفید چاندنی سے اڑتے بادل، پہاڑوں پر بنے رنگ برنگے گھر، سبزے سے ڈھکے پہاڑ، وادیوں میں بہتی جھیل، جھرنے، منھ کو چومنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور دلکش نظارے، بس دیکھتے رہو اور دیکھنے سے کبھی جی نہ بھرے۔ بادلوں کی آنکھ مچولی سفر کو مزید خوبصورت بنا رہی تھی، کبھی ایک دم سے بادل آگھیرتے اور سارا منظر دھندلا جاتا تو کبھی بادل کا سراغ ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔ زندگی جینے کے لیے نظروں کی نہیں نظاروں کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہاں تو نظاروں کا بازار تھا۔"

صفحہ ۲۰۷تا۲۴ میں اپنے اپنے مقاصد اور منہجِ فکر کے اعتبار سے مختلف دو عظیم درسگاہوں کے اسفار قلمبند ہیں جس میں دارالعلوم دیوبند کے سفر کو مصنف نے" آنکھ نے جو کچھ دیکھا "عنوان دیا ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی روداد" چمنِ شبلی سے گلشنِ سرسید تک "کے نام سے پیش کی ہے۔ یقیناً یہ دونوں تحریریں قارئین کے لیے اداروں سے عقیدتوں میں اضافہ کا سبب بنیں گی۔

ان صفحات کے بعد" کوڑہ جہان آباد "اور" فتح پور "کے سفر کو" یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں "کے عنوان کے تحت جگہ دی ہے۔ اسی طرح" الف سے الہ آباد "کے سفر نامے میں گنگا اور جمنا کا سنگم، مساجد کی دلنشیں اذانیں، مندروں کے گھنٹے اور سادھوؤں کے شنکھوں کی گونج ایک ہم آہنگی کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔

کتاب کا آخری سفر نامہ ہمارے قریبی شہر سیتاپور اور اس کے مضافات سے متعلق ہے جسے مصنف نے حسین اور تلخ یادوں کے ساتھ" غبارِ آوارگی "کے زیرِ عنوان سمیٹ کر کتاب پر خاتمے کی مہر لگا دی۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مصنف کا اسلوب نہایت سادہ، رواں اور پر کشش ہے۔ پروف ریڈنگ اس درجے کی ہے کہ از اوّل تا آخر کوئی لفظ ادھر سے اُدھر نہیں پایا۔ شہروں کی تاریخی اور جغرافیائی حیثیت نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کی ہے، شخصیات کا تعارف بھی نپے تلے الفاظ میں کرایا ہے۔ البتہ بعض جگہوں پر غیر ضروری تفصیل بوریت کا سبب بھی بنی ہے۔ اور بعض مقامات پر اردو کے بہترین متبادل ہونے کے باوجود انگریزی الفاظ کا استعمال سمجھ سے پرے ہے، جس کے لئے مصنف کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتا کیوں کہ تقریباً ہم سبھی کے ارد گرد ماحول ہی کچھ ایسا بن چکا ہے۔

اس کے باجود یہ ایک قابل قدر سفر نامہ ہے۔ جس کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ ہماری نسل سے اس قسم کے کارنامے اب نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں۔ ایسے میں یہ کتاب ایک خوشگوار جھونکے کی مانند ہے، جس کا آپ مطالعہ کریں گے تو اس کی بہت خوبیاں آپ پر منکشف ہوں گی۔ معلومات و تعبیرات کا ذخیرہ لیکر اٹھیں گے۔

بقیہ مجموعے کے دوسرے ایڈیشن کے لیے برادرم کو ڈھیروں نیک خواہشات

اے وادیٔ خشک و سبز پربت
تو اپنی خوشبو سے ڈر رہی ہے
ترے صحیفہ نما بدن پر
یہ کیسی آیت اتر رہی ہے
ترے فسوں ناک راستوں پر
گھنیری رت کی مسافتیں ہیں
فضائیں پہروں میں بٹ چکی ہیں
ہواؤں تک میں عداوتیں ہیں
سکوت زنداں کی پتلیوں پر
نگاہ تیرہ نظر کا دکھ ہے
ہر ایک روزن سے آتا جاتا
تری جبیں پر اگی لکیریں
صف شکستہ سپاہ جیسے
سو اب فقط دن گزر رہے ہیں
صدائے زنجیر مستقل سے
نہ رونق نو نہ دھوپ کی لو
اتر گئی جان جیسے دل سے
شراب آنکھوں سے اگتا جھرنا
ادھر کا دکھ ہے ادھر کا دکھ ہے
فرشتگان وحی کے ہاتھوں
سے سارے الفاظ گر چکے ہیں
قلندران روایت رد
خود اپنے دیں سے ہی پھر چکے ہیں
بغاوتوں کے علم پہ کندہ
اطاعتوں کا نشان واقف
اصول گاہوں کے منبروں پر
شرائط حکم و شیخ و منصف
ترے تنفس کے پیش و پس پر
لبوں کی لغزش گواہ جیسے
بھٹک کے رستہ سا بن رہا ہے
بڑھا تعدد سرور وے کا
جنون دستک کو جن رہا ہے
اے وادیٔ خشک و سبز پربت
تو اپنی خوشبو سے ڈر رہی ہے
ترے صحیفہ نما بدن پر
یہ کیسی آیت اتر رہی ہے

تبصرہ:

عاطف توقیر کی نظم " رد "ایک علامتی اور استعاراتی نظم ہے جو ہمارے عہد کے فکری، سماجی اور روحانی زوال کو نمایاں کرتی ہے۔ اس نظم کا مرکز یا استعارہ" وادیٔ خشک و سبز پربت "ہے، جو ایک طرف سرسبزی، خوشبو اور زندگی کی علامت ہے مگر دوسری طرف خشک سالی، ویرانی اور خوف سے لبریز ہے۔ اس سے شاعر نے وہ داخلی و خارجی کشمکش واضح کی ہے جس میں فرد اور معاشرہ دونوں مبتلا ہیں۔ عاطف توقیر کی نظم " رد "فنی اور فکری سطح پر بہت گہری ہے۔ ہم اس کے دونوں پہلوؤں کو الگ الگ دیکھیں گے:

فنی پہلو

اس نظم کا اسلوب علامتی اور استعاراتی ہے۔ شاعر نے " صحیفہ نما بدن "، " تری جبیں پر اگی لکیریں، صف شکستہ سپاہ جیسے "اور" شراب آنکھوں سے اگتا جھرنا "جیسے پُراثر استعارے تراشے ہیں، جو قاری کو فضا کی شدت کا براہِ راست احساس دلاتے ہیں۔ نظم کی ابتدا اور اختتام ایک ہی مصرعے پر ہوتا ہے۔

ع "اے وادیٔ خشک و سبز پربت تو اپنی خوشبو سے ڈر رہی ہے"

یہ تکنیک نظم کو گولائی اور دائرہ نما ساخت دیتی ہے جس سے اس کے پیغام کی گونج اور شدت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مصرعوں کے آہنگ اور صوتی تکرار سے موسیقیت قائم کی گئی ہے۔ نظم کے مناظر میں المیہ فضا ہے جو ہر شے پر اداسی اور شکست کا پردہ ڈال دیتی ہے لیکن ساتھ ہی اس میں احتجاج اور سوال کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔

۱- ہیئت، بحر اور وزن:

یہ نظم منظوم نظم ہے اور مربع شکل میں ہے۔ یہ بحر "جمیل مربع سالم "میں کہی گئی ہے اور اس کا وزن" مَفاعلاتن، مَفاعلاتن "ہے۔

اس بات کی اہمیت یہ ہے کہ شاعر نے جدید فکری مواد کو بھی عروضی سانچے میں ڈھالا ہے۔

بحر کے تسلسل نے نظم کو موسیقیت اور لے دی ہے، جس سے کلام کا اثر اور گہرا ہو جاتا ہے۔

۲ - قافیے اور صوتی آہنگ:

یہ نظم پابند نظم ہے اور مربع شکل میں ہے۔ شاعر نے صوتی تکرار اور داخلی ہم آہنگی سے ایک جمالیاتی ربط پیدا کیا ہے:

"ادھر کا دکھ ہے، ادھر کا دکھ ہے "صوتی تکرار۔

"ترے فسوں ناک راستوں پر، گھنیری رت کی مسافتیں ہیں "حرفی تکرار (ف، س، ر کی صوتی ہم آہنگی)۔

"صدائے زنجیر مستقل سے "مصرعے کی صوتی ساخت خود زنجیر کی جھنجھناہٹ کا احساس دیتی ہے۔

۳ ۔حرفی تکرار کی صوتی ہم آہنگی:

حرفی تکرار کی صوتی ہم آہنگی" سے مراد یہ ہے کہ شاعر نے کچھ مخصوص حروف بار بار استعمال کیے ہیں تاکہ ایک خاص صوتی فضا اور موسیقیت پیدا ہو۔"ادھر کا دکھ ہے،ادھر کا دکھ ہے "جیسی تکرار نظم کے ردھم کو قائم رکھتی ہے اور بیانیہ میں شدت پیدا کرتی ہے۔"ز "اور" ر "کی تکرار") زنجیر"،" زندان"،" نظر (" نظم کو صوتی سطح پر بھی گھٹن کی کیفیت میں ڈھال دیتی ہے۔ "مثال کے طور پر:

"فسوں ناک راستوں پر "یہاں ف اور س کی تکرار ہے۔

"سکوت زنداں "یہاں س کی گونج ہے۔

"ترے صحیفہ نمابدن پر "، یہاں ص اور ف کی بازگشت ہے۔

"صدائے زنجیر مستقل سے "ص، س اور ز کی آوازیں ایک تاثر بناتی ہیں۔

یہی بار بار کی تکرار قاری کے کان میں ایک ردھم پیدا کرتی ہے، جیسے ہلکی سی سرگوشی یا گونج، جو نظم کے مزاج (یعنی بوجھل، پراسرار اور کبھی کبھی خوفناک فضا) کو مزید ابھارتی ہے۔یعنی شاعر نے محض الفاظ کے معنی پر نہیں بلکہ ان کی آوازوں پر بھی کام کیا ہے تاکہ تاثر زیادہ گہرا ہو۔

۴-استعارات، تشبیہات، امیجز اور علامات:

نظم کی فنی خوبی اس کے استعارات، تشبیہات، امیجز اور علامات ہیں:

"سکوت زنداں کی پتلیوں پر، نگاہ تیرہ نظر کا دکھ ہے "یہاں آنکھ اور زنداں کو ملا کر گھٹن اور بیزاری کو مجسم بنا دیا گیا۔

"جبیں پر اگی لکیریں، صف شکستہ سپاہ جیسے "انسانی چہرے پر لکیر کو شکستہ فوج کی صف سے تشبیہ دینا نہایت تازہ اور طاقتور امیج ہے۔

"شراب آنکھوں سے اگتا جھرنا "یہ ایک تخلیقی اور غیر روایتی امیج ہے جو جذبات کی شدت کو بصری کیفیت میں بدل دیتا ہے۔"اور غم کو اشک اور سرور کے ساتھ جوڑتا ہے۔

وادی، خوشبو، صحیفہ، آیت، زنجیر، شراب، سب علامات ہیں جو مختلف ذہنی، روحانی اور سیاسی پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔"صحیفہ نمابدن " وادی کو مذہبی کتاب کی علامت بنانا۔

۵ ۔اسلوب زبان کا آہنگ:

زبان علامتی اور شعری ہے۔سیدھی نثری بیانیہ نہیں۔

زبان شعری، علامتی اور قدرے صوفیانہ ہے۔" فرشتگانِ وحی، قلندرانِ روایت، اصول گاہوں کے منبر "جیسے تراکیب نظم کو فکری گہرائی دیتی ہیں۔ گو زبان میں کہیں کہیں صوفیانہ اور مذہبی لے جھلکتی ہے لیکن مقصد احتجاج ہے، جس سے اسلوب میں مزاحمتی وقار پیدا ہوا ہے۔

ترکیبیں" صحیفہ نمابدن"،" قلندرانِ روایت"،" اصول گاہوں کے منبر "جیسے مرکبات نظم کو فکری اور تہذیبی پس منظر سے جوڑتی ہیں۔

۶ ۔ساخت اور تسلسل:

نظم آغاز میں فطرت کے منظر سے چلتی ہے") اے وادیٔ خشک و سبز پربت(")، پھر دھیرے دھیرے یہ منظر معاشرتی اور فکری زوال کی علامت میں بدل جاتا ہے۔درمیان میں" وحی"،" قلندر"،" شیخ و منصف "جیسے الفاظ نظم کو تہذیبی و دینی سیاق سے جوڑ دیتے ہیں۔آخر میں یہ نظم "زنجیر "اور" دل سے اترتی جان "پر منتج ہوتی ہے، جو ایک بوجھل فضا تو بناتی ہے مگر ساتھ ہی احتجاجی صدائے مسلسل کو قائم رکھتی ہے۔

۷ ۔کلاسیکی اور جدید امتزاج:

ایک طرف بحر، مصرعہ بندی اور لے کلاسیکی روایت کا تسلسل ہیں۔ دوسری طرف علامتیں، سماجی احتجاج، مذہبی اداروں پر تنقید اور وجودی کیفیتیں مکمل طور پر جدید حسیت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہی امتزاج اس نظم کی سب سے بڑی فنی کامیابی ہے۔

۸ ۔موسیقیت:

نظم میں شعری بہاؤ، آہنگ اور سطر کی ترتیب میں گہری موسیقیت موجود ہے۔

"تو اپنی خوشبو سے ڈر رہی ہے "کا تکرار آغاز و انجام پر ایک علامتی دائرہ بناتا ہے، جیسے سوال وہیں آکر رک گیا ہو جہاں سے چلا تھا۔

نظم میں آہنگ اور مصرعوں کی ہم آہنگی ایک شعری ربط پیدا کرتی ہے۔ وقفوں اور تکرار سے موسیقیت ابھرتی ہے۔

۹ ۔مزاج:

نظم کا مجموعی مزاج" المیہ "ہے، مگر اس المیے کے پس منظر میں" سوال "اور" مزاحمت "دونوں موجود ہیں۔

۱۰۔طنز، رمز اور مزاحمتی لہجہ:

شاعر کا لہجہ کہیں نوحہ خوان ہے، کہیں منقلب صوفی، اور کہیں مزاحم دانشور۔

"قلندرانِ روایت رد، خود اپنے دیں سے پھر چکے ہیں "یہ خود ساختہ صوفیوں یا علماء پر گہرا طنز ہے۔

۱۱۔تکرار اور علامتی دائرہ:

نظم کی ابتدا اور اختتام ایک ہی مصرعے سے ہوتی ہے") اے وادیٔ خشک و سبز پربت۔۔۔ تو اپنی خوشبو سے ڈر رہی ہے(" ، جو نظم کو دائرے کی شکل میں باندھ دیتا ہے۔ یہ تکنیک پیغام کی شدت کو دوگنا کر دیتی ہے۔

فنی اعتبار سے یہ نظم عروضی جلال، صوتی آہنگ، علامتی امیجز اور مزاحمتی اسلوب کی ایک کامیاب مثال ہے۔ شاعر نے کلاسیکی ہیئت کو اختیار کرتے ہوئے بھی فکر اور امیجز میں جدت پیدا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظم نہ صرف موضوع کے اعتبار سے اہم ہے بلکہ فنّی اعتبار سے بھی اپنی جگہ ایک مکمل اور مؤثر تخلیق ہے۔

فکری پہلو

یہ نظم ہمارے عہد کے داخلی و خارجی زوال کی علامت ہے۔ شاعر نے وادی، سبز پربت، صحیفہ، آیت، فرشتے، قلندر اور منبر جیسے استعاروں کے ذریعے ایک ایسا منظر نامہ تخلیق کیا ہے جس میں معاشرتی، مذہبی اور فکری بحران ایک دوسرے میں گتھے نظر آتے ہیں۔" ہواؤں تک میں عداوتیں ہیں "اور" فضائیں پہروں میں بٹ چکی ہیں "جیسے مصرعے اس تقسیم اور دشمنی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو ہماری اجتماعی فضا پر چھائی ہوئی ہے۔ اسی طرح" فرشتگانِ وحی کے ہاتھوں سے سارے الفاظ گر چکے ہیں "محض روحانی اقدار کے زوال ہی کی نہیں بلکہ سچائی اور صداقت کی موت کی علامت بھی ہے۔" قلندرانِ روایت رد "دراصل ان مذہبی و فکری پیشواؤں پر طنز ہے جو روایت کے نام پر خود اپنے اصولوں سے منحرف ہو چکے ہیں۔ اس نظم کا فکری کینوس اس بات پر مرکوز ہے کہ سماج میں اقدار کی پامالی اور سچائی کی شکست نے فرد کو بھی مایوس اور شکستہ دل کر دیا ہے۔

۱ ۔نظم کا مرکزی خیال:

نظم ایک زوال پذیر معاشرے، اس کی روحانی، فکری اور تہذیبی شکست و ریخت کی تصویر پیش کرتی ہے۔ شاعر ایک ایسی وادی سے خطاب کرتا ہے جو کبھی" خوشبو "رکھتی تھی یعنی معنویت، صداقت، اور روحانیت کی علامت تھی مگر اب وہ خود اپنی خوشبو سے" ڈر رہی ہے"۔

۲ ۔انکار اور بغاوت کا بنیادی تصور:

عنوان " رد "بذاتِ خود کسی ایسے رویے کی طرف اشارہ ہے جو رائج الوقت نظام، روایت یا فکر کو مسترد کرتا ہے۔ نظم میں جگہ جگہ یہ کیفیت جھلکتی ہے کہ شاعر محض احتجاج نہیں کر رہا بلکہ جمی ہوئی اقدار اور مسلط کردہ فکری سانچوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ "قلندرانِ روایت رد، خود اپنے دیں سے ہی پھر چکے ہیں "، یہاں مذہبی و سماجی روایت کے نمائندوں کی منافقت اور دوغلے پن پر ضرب لگائی گئی ہے۔

۳-روایت اور وحی کا زوال:

شاعر نے ایک اہم نکتہ یہ اٹھایا ہے کہ وہ الفاظ جو کبھی وحی کی علامت تھے، وہ اب اپنا جلال کھو چکے ہیں:

"فرشتگانِ وحی کے ہاتھوں سے سارے الفاظ گر چکے ہیں"

یہ محض مذہبی استعارہ نہیں بلکہ اس سے مراد وہ سچائیاں ہیں جو کبھی معاشروں کو جِلا دیتی تھیں، مگر اب طاقت اور مفاد پرستی کے بوجھ تلے مسخ ہو گئی ہیں۔

۴ -وجودی، روحانی، شخصی کرب اور تھکن:

" ادھر کا دکھ ہے، اُدھر کا دکھ ہے "ہر طرف رنج ہی رنج، داخلی و خارجی انتشار کی ترجمانی ہے۔" سو اب فقط دن گزر رہے ہیں، صدائے زنجیر مستقل سے "زندگی بے جان اور غلامی سے تعبیر ہو گئی ہے۔"نہ رونق نونہ دھوپ کی لو۔۔۔اتر گئی جان جیسے دل سے "فرد کی مایوسی، حوصلوں کی شکست اور اندرونی زوال کا عکس ہے۔

پوری نظم کی فضا ایک قید خانہ ہے۔" سکوت زنداں"،" صدائے زنجیر"،" ادھر کا دکھ ہے ادھر کا دکھ ہے "، یہ سب استعارے اجتماعی گھٹن اور فرد کی کچلی ہوئی زندگی کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک وجودی کرب بھی ہے: قید صرف جسمانی نہیں بلکہ ذہنی اور فکری ہے۔

شاعر نے اجتماعی مسائل کو فرد کے اندر اتار دیا ہے۔" لبوں کی لغزش"،" جبیں پر اگی لکیریں"،" صف شکستہ سپاہ جیسے "، یہ سب داخلی شکست و ریخت کی تصویریں ہیں۔ گویا پوری کائنات کی گھٹن فرد کے وجود میں اتر کر اس کے چہرے، سانس اور آنکھوں میں ظاہر ہو رہی ہے۔

۵ -طاقت اور مذہب کی آمیزش پر تنقید:

"بغاوتوں کے علم پہ کندہ، اطاعتوں کا نشان واقف "،"اصول گاہوں کے منبروں پر، شرائط حکم و شیخ و منصف"، یہاں شاعر نے اس جبر پر روشنی ڈالی ہے جہاں بغاوت بھی اطاعت کے نشان تلے دبا دی جاتی ہے۔ مذہب، سیاست اور عدلیہ کے نمائندے سب جبر کے اوزار بن گئے ہیں۔

۶-اجتماعی، سماجی و تہذیبی بحران:

" ترے صحیفہ نما بدن پر، یہ کیسی آیت اتر رہی ہے "یہاں شاعر روحانی گمراہی یا مذہبی استحصال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔" فرشتگانِ وحی کے ہاتھوں سے سارے الفاظ گر چکے ہیں "یہ الہام کے خاتمے یا سچائی کی گمشدگی کی علامت ہے۔ نظم میں معاشرے کے بگڑتے حالات کا نوحہ جھلکتا ہے۔"ہواؤں تک میں عداوتیں ہیں "سے دشمنی اور کدورت کا غلبہ ظاہر ہوتا ہے۔"فرشتگان وحی کے ہاتھوں سے سارے الفاظ گر چکے ہیں " وحی والہام کی قدریں، سچائی اور صداقت جیسے الفاظ اپنی حرمت کھو بیٹھے ہیں۔"قلندرانِ روایت رد، خود اپنے دیں سے ہی پھر چکے ہیں "روایت پرست خود اپنے اصولوں سے منہ موڑ چکے ہیں۔

۷ -فطرت اور وجود کا باہمی تضاد اور شکست:

" فضائیں پہروں میں بٹ چکی ہیں، ہواؤں تک میں عداوتیں ہیں "معاشرتی تقسیم اور روحانی پراگندگی کو ظاہر کرتی ہے۔"اطاعتوں کا نشان بغاوت کے علم پر کندہ "نظامِ اقدار میں اُلجھاؤ، جہاں فرمانبرداری خود بغاوت کا نقاب اوڑھ لیتی ہے، کی علامت ہے۔ شاعر نے وادی، سبز پربت، خوشبو، رت اور فضاؤں کے ذریعے فطرت کے حسن کو دکھایا، لیکن اس کے ساتھ ہی خوف، عدوات اور اندھیروں کو بھی ساتھ رکھا ہے۔ گویا

فطرت اور وجود کا باہمی تضاد ظاہر کیا گیا ہے۔ "اے وادیٔ خشک و سبز پربت، تو اپنی خوشبو سے ڈر رہی ہے " یہاں خوشبو بھی خوف زدہ ہے، یعنی حسن بھی غیر محفوظ ہو چکا ہے۔

۸-مزاحمت اور سوالیہ لہجہ:

شاعر کے ہاں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اطاعت کے جھنڈے کیوں بغاوتوں پر لہرائے جا رہے ہیں، اور اصولوں کے منبر کیوں ذاتی مفاد اور حکمراں طبقے کے ہاتھوں یرغمال ہو گئے ہیں۔ یہ نظم داخلی و خارجی کشمکش کا بیان ہے۔ شاعر نے ایک " وادی "کا استعارہ لیا ہے جو ایک طرف سبز و شاداب ہے اور دوسری طرف خشک و ویران۔ اس وادی کی " خوشبو سے ڈرنا "گویا اپنی اصل شناخت، اپنی پاکیزگی اور اپنے حسن سے خوفزدہ ہو جانا ہے۔ یوں نظم ایک اجتماعی زوال، مذہبی و سماجی تضادات، اور فرد کے وجودی دکھ کی گواہی بن جاتی ہے۔

" رد " محض ایک نظم نہیں بلکہ معاشرتی زوال، مذہبی منافقت اور فرد کی شکستگی پر گہرا احتجاج ہے۔ شاعر نے تصوف، روایت اور جدید فکری سوالوں کو علامتی پیکر میں باندھ کر ایک ایسا شعری کینوس تخلیق کیا ہے جس میں قاری اپنے دور کے دکھوں کی جھلک صاف دیکھ لیتا ہے۔

۹ -ایک مزاحمتی اور امید پر مبنی شعور:

یہ نظم مایوسی کے اندر بھی زندہ شعور اور بیداری کی علامت ہے اور یہی تواصل " رد " ہے۔ یعنی انکار بذاتِ خود امید کا اظہار ہے۔ دیکھیے:

ے "اے وادیٔ خشک و سبز پربت تو اپنی خوشبو سے ڈر رہی ہے "

یہاں خوشبو کا ڈر جانا محض گھٹن نہیں بلکہ یہ اشارہ ہے کہ خوشبو اب بھی موجود ہے بس اسے دبایا جا رہا ہے۔ خوشبو کا زندہ رہنا امید ہے۔

ع "ادھر کا دکھ ہے، ادھر کا دکھ ہے "

یہ دہرا دکھ اس بات کی علامت ہے کہ انسان اب بھی دیکھ رہا ہے، محسوس کر رہا ہے۔ مردہ دل دکھ کو پہچانتا ہی نہیں۔

ے "شراب آنکھوں سے اگتا جھرنا بھٹک کے رستہ سا بن رہا ہے "

یہ منظر سراسر امید کا ہے۔ آنکھوں کا جھرنا بھٹکا ضرور ہے مگر بہاؤ میں ہے، اور بہاؤ ہی زندگی کی علامت ہے۔ یعنی نظم کا بیانیہ اندھیرے اور گھٹن سے ضرور بھرا ہوا ہے، لیکن اس گھٹن کے مقابل ایک مزاحمتی رویہ اور " رد "کا شعور موجود ہے، جو عین زندگی اور امید کا استعارہ ہے۔ یہ نظم محض یاسیت نہیں بلکہ ایک مزاحمتی اور امید پر مبنی شعور رکھتی ہے۔ شاعر احتجاج کرتا ہے، سوال اٹھاتا ہے، اور یہی احتجاج مستقبل میں روشنی کی تلاش کی بنیاد ہے۔

۱۰-فکری اہمیت:

یہ نظم دراصل جدید اردو شاعری میں اس کرب اور بغاوت کی نمائندگی کرتی ہے جو استبدادی قوتوں، مذہبی منافقت، روایت پرستی اور وجودی گھٹن کے خلاف پیدا ہوا۔ اس میں اقبال کی طرح اصلاحی جوش نہیں، بلکہ ایک گہری مایوسی اور احتجاجی کیفیت ہے جو اسے جدید حسیت کے قریب لاتی ہے۔ مجموعی جائزہ

عاطف توقیر کی نظم " رد "ایک تہذیبی ماتم ہے جہاں شاعر نہ صرف زوال کو محسوس کرتا ہے بلکہ اس کی جڑوں کو پہچانتا ہے۔ یہ نظم جدید اردو نظم کے اعلیٰ نمونوں میں شمار کی جا سکتی ہے جس میں خیال کی گہرائی، زبان کی بالیدگی اور روحانی اضطراب کی جھلک ملتی ہے۔

"رد "ایک ایسی نظم ہے جو فرد اور معاشرے دونوں کے دکھ کو علامتی اور استعاراتی زبان میں بیان کرتی ہے۔اس میں فیض احمد فیض کی طرح احتجاجی روح بھی جھلکتی ہے اور ناصر کاظمی جیسی وجودی مایوسی بھی محسوس ہوتی ہے۔ مگر توقیر نے انہیں اپنے منفرد علامتی پیرائے میں ڈھال کر معاصر اردو نظم کو ایک الگ اور بھرپور آواز عطا کی ہے۔

زیرِ نظر نظم اپنے اندر معنویت اور فنکارانہ کمال کے کئی جہان سمیٹے ہوئے ہے۔شاعر نے وادی کے استعارے کو مرکزی حیثیت دے کر زندگی کے تضادات،انسانی کرب اور اجتماعی صورتِ حال کو اجاگر کیا ہے۔" خشک و سبز پربت "کا پیکر بظاہر متضاد عناصر کو ایک ساتھ لا کر قاری کو اس مکالمے میں شریک کرتا ہے جہاں خوف اور خوشبو ایک ہی فضا میں سانس لیتے ہیں۔اس فنی چابک دستی سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ زندگی صرف جمود اور بے سمتی کا نام نہیں بلکہ اس میں امید کا ایک ایسا بیج بھی پوشیدہ ہے جو ہر لمحہ پھوٹنے کے لیے بے قرار رہتا ہے۔

فکری سطح پر یہ نظم اپنے عہد کے مسائل اور انسانی داخلی کشمکش کا عکاس ہے۔شاعر نے فضاؤں کے بٹنے،ہواؤں میں عداوت اور سکوتِ زنداں کی تصویر کھینچ کر ایک ایسا منظر نامہ تشکیل دیا ہے جو بظاہر مایوس کن دکھائی دیتا ہے۔تاہم اس کے پس منظر میں ایک غیر مرئی طاقت موجود ہے جو قاری کو یاد دلاتی ہے کہ زندگی رُکتی نہیں،دن بہر حال گزرتے رہتے ہیں اور جستجو کا عمل جاری رہتا ہے۔یوں یہ نظم یکسر یاسیت پر مبنی نہیں بلکہ اس کے بطن میں امید اور استقامت کا پہلو پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔

فنی اعتبار سے یہ نظم "بحر جمیل مربع سالم "میں کہی گئی ہے جس نے اسے ایک باقاعدہ عروضی ساخت عطا کی۔ قافیے اور ردیف کی موجودگی نے نظم میں داخلی ہم آہنگی اور صوتی موسیقیت پیدا کی۔استعاراتی زبان اور علامتی پیکروں نے نظم کے داخلی تناظر کو مزید گہرائی بخشی۔" صحیفہ نما بدن"،" سکوت زنداں کی پتلیاں "اور" شراب آنکھوں سے اگتا جھرنا "جیسے استعارات محض لفظی آرائش نہیں بلکہ فکری تجربے کی عکاسی ہیں۔یہ تراکیب قاری کو محض خارجی دنیا میں نہیں بلکہ داخلی شعور کی تہوں میں بھی لے جاتی ہیں۔

مجموعی طور پر یہ نظم اپنی فکری معنویت اور فنی صناعی دونوں اعتبار سے اہم ہے۔اس میں زندگی کے تضادات کو فنکارانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے مگر ان تضادات کے پس منظر میں امید اور جستجو کا پیغام واضح طور پر موجود ہے۔یہی پہلو اس نظم کو نہ صرف اپنے عہد کی صدائے احتجاج بناتا ہے بلکہ اسے آفاقی سطح پر بھی معنویت عطا کرتا ہے۔

آخر میں،" رد "نہ صرف داخلی شکستگی اور وجودی کرب کی عکاسی کرتی ہے بلکہ اجتماعی زوال اور مذہبی و سماجی منافقت کے خلاف ایک احتجاجی صدا بھی بلند کرتی ہے۔اس طرح یہ نظم فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری اور ناصر کاظمی کی وجودی مایوسی دونوں کی روایت سے جڑتی ہے، لیکن اپنی علامتی اور صوفیانہ زبان کے سبب ایک منفرد اور معاصر آواز کے طور پر سامنے آتی ہے۔

حاصل بحث:

اس نظم کا بنیادی حاصل یہ ہے کہ شاعر نے عصرِ حاضر کے تضادات،سماجی جمود اور داخلی کرب کو نہایت فنکارانہ طور پر پیش کیا ہے۔بظاہر منظر نامہ مایوسی اور بے سمتی سے بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے، لیکن اس کے باطن میں امید اور جستجو کا پہلو پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے۔یہی تضاد نظم کی اصل معنویت کو تشکیل دیتا ہے۔فنی اعتبار سے " بحر جمیل مربع سالم" نے اسے ایک مربوط ڈھانچہ عطا کیا،جب کہ استعارات،علامتی پیکروں اور صوتی ہم آہنگی نے نظم کو گہرائی اور تاثیر بخشی۔اس طرح یہ نظم اپنے عہد کی عکاسی بھی کرتی ہے اور آفاقی معنویت بھی رکھتی ہے، کیونکہ یہ دکھاتی ہے کہ انسان مشکلات کے باوجود اپنے وجودی سفر کو جاری رکھتا ہے۔

ڈاکٹر سعدیہ بتول حیدرؔ

شاعری
سچ بولتی
ہے

حمدِ باری تعالیٰ

نُور ہے تیرا اجمالی، خالقِ کون ومکاں!..
تیری وَحدَت شان والی، خالقِ کون ومکاں!..
ہو گئے تخلیق عالم تُونے جو نہی کن کہا
تیری خَلاقی نِرالی، خالقِ کون ومکاں!..
یہ ستارے، یہ نَظارے، یہ زَمین وآسماں
ہیں سَبھی تیرے سُوالی، خالقِ کون ومکاں!..
زندگی میں رَنگ بھر دیتی ہے تیرے حکم سے
پھیلے جب سورج کی لالی، خالقِ کون ومکاں!..
شَب کی تاریکی مِٹانے چاند کا تحفہ دِیا
چاندنی بھی دی مِثالی، خالقِ کون ومکاں!..
سامنے دَریا تھا، پیچھے لشکرِ فرعون تھا
کیا سے کیا صورَت نِکالی، خالقِ کون ومکاں!..
جب پَڑا دریا کے سِینے پر عَصائے موسَوی
بَن گیا رستہ مِثالی، خالقِ کون ومکاں!..
گلشنِ ہَستی میں آئی تیری رَحمت سے بَہار
جھوم اٹھی ہے ڈالی ڈالی، خالقِ کون ومکاں!..
عاشِقوں پر سب سے بَڑھکر جو تِرا اِحسان ہے
وہ ہیں نعمت نُور والی ﷺ، خالقِ کون ومکاں!..
مجھ نفیسؔ احمد کا یارب کون ہے تیرے سِوا
میں تو ہوں تیرا سُوالی، خالقِ کون ومکاں!..

نفیس ؔناندوروی، مہاراشٹر (انڈیا)

نعت"

جسے بھی رحمت پروردگار حاصل ہے
اسے تو دونوں جہاں میں وقار حاصل ہے
یقین مانئے گلشنے باغجنتوہ
جسے مدینے کی فصل بہار حاصل ہے
شمار ہوتے ہیں وہ لوگ خوش نصیبوں میں
جنھیں حبیب خدا کا دیار حاصل ہے
وہ صدق وعدل وسخاوت رکھے شجاعت بھی
جسے بھی فیض درچاریار حاصل ہے
بروز حشر خدایا یہی بھرم رکھنا
یہ جو ترا کرم بے شمار حاصل ہے
عمل کا اپنے بھروسا نہیں مگر مولی
ترے حبیب کا بس اعتبار حاصل ہے
شمار کرتے ہیں سب ان کے نعت خوانوں میں
مجھے بھی یہ سند افتخار حاصل ہے
جو ان کی یاد میں رہتا ہے مست اے رضواں
اسی کو دونوں جہاں میں قرار حاصل ہے۔

ڈاکٹر رضوان الرضا رضوان

بنے ہو جو رہبر وغیرہ وغیرہ
ہے شہرت کا چکر وغیرہ وغیرہ

میرے ساتھ خود بیٹھ کر پی چکے ہیں
خمار اور ساغر وغیرہ وغیرہ

نئی اِک غزل آج چھیڑی ہے میں نے
قوافی ہیں زر، پر وغیرہ وغیرہ

غلط کہہ رہے ہو کہ ہونگے برابر
وسیم اور جوہر وغیرہ وغیرہ

گلے ساؤنی رت میں ملنے لگے ہیں
ندی اور سمندر وغیرہ وغیرہ

جہاں دیکھئے آج ٹکرا رہے ہیں
مؤنث، مذکر وغیرہ وغیرہ

ترنم کے مارے ہوؤں کو کھلاؤ
دہی اور شکّر وغیرہ وغیرہ

سبھی ایک صف میں نظر آ رہے ہیں
گویئے، سخنور وغیرہ وغیرہ

تمہیں شرم کس بات پر آ رہی ہے
نہ متلی نہ چکر وغیرہ وغیرہ

صدائیں یہ اٹھیں میرے شعر سن کر
مکرّر، سہ کرر وغیرہ وغیرہ

دکھاتی ہے اب تو نئی شاعرہ بھی

ترنم کا جوہر وغیرہ وغیرہ

ادب میں بہر دور زندہ رہیں گے

جگر اور اصغر وغیرہ وغیرہ

میاں پاپولر توڑ کر پھینک بھی دو

یہ مینا یہ ساغر وغیرہ وغیرہ

****

پروین شغف—دہلی

عشق میں اس نے یہ کیا کیا بناڈالا
خود خدا ، مجھ کو فرشتہ بناڈالا

غمزہ، سفّاک نگہ نے مری خاطر
پھر پری وش کوئی دوجہ بناڈالا
درد کیا کہتی میں شب تاب سے یارو !
عشق کا کس نے یہ لہجہ بناڈالا
روح کی تھاپ پہ جو رقص کیا تھا
اس کو محشر کا ہی نقشہ بناڈالا
اب عدم کی ہوں مسافر میں کروں کیا
حسن یاراں نے یہ شیوہ بناڈالا

****

ڈاکٹر اسعد بدایونی

بچھڑ کے تجھ سے کسی دوسرے پہ مرنا ہے
یہ تجربہ بھی اسی زندگی میں کرنا ہے
ہوا درختوں سے کہتی ہے دکھ کے لہجے میں
ابھی مجھے کئی صحراؤں سے گزرنا ہے

میں منظروں کے گھنے پن سے خوف کھاتا ہوں
فنا کو دست محبت یہاں بھی دھرنا ہے
تلاش رزق میں دریا کے پنچھیوں کی طرح
تمام عمر مجھے ڈوبنا ابھرنا ہے
اداسیوں کے خدوخال سے جو واقف ہو
اک ایسے شخص کو اکثر تلاش کرنا ہے

****

تمنّا جعفری

آپ سے عشق کے ہے سود نتیجے میں کہ بس
روتے رہتے ہیں پڑے آپ کے رستے میں کہ بس
ایک عرصہ ہوا اُن سے نہ ملاقات، نہ بات
اب بھی اِک ہوک سی اٹھتی ہے کلیجے میں کہ بس
آنکھ جو بند کی ہر سمت تھا ہو کا عالم
ایسے تنہا نظر آئے یہاں میلے میں کہ بس
گھر کے یوں ٹکڑے ہوئے کوئی کہیں کوئی کہیں
پھوٹ ایسی تھی پڑی چاچا بھتیجے میں کہ بس
سینے پر ہاتھ تھا اور آنکھ سے آنسو تھے رواں
جانے کیا کچھ تھا لکھا ایک لفافے میں کہ بس
اندھی تقلید سے انساں کو بچالے مولا
بہے جاتے ہیں کہیں پانی کے ریلے میں کہ بس
پاؤں پھیلانے کی مشکل سے جگہ ملتی ہے
اتنا چھوٹا سا ملا گھر مجھے ورثے میں کہ بس
کوئی ارمان نہ پورا ہوا میرے دل کا
جان کچھ ایسی پھنسی گھر کے جھمیلے میں کہ بس
اب نہ خواہش, نہ 'تمنّا ' کوئی باقی دل میں
اتنے غم آپ سے ہم کو ملے تحفے میں کہ بس

تمنّا جعفری بہرائچ، اتر پردیش

****

ذیشان نیازی - کانپور

تڑپ رہی ہے جبیں اپنی سنگ در کے لیے
بس ایک سجدہ ہی کافی ہے عمر بھر کے لیے
جو اک نظر سرِ محفل اٹھی تھی میری طرف
ترس رہی ہے نظر میری اس نظر کے لئے
اجالے بانٹ کے دنیا کو یہ خیال آیا
کوئی چراغ نہیں رکھا اپنے گھر کے لیے
شکستہ جسم سے صدیوں کا بوجھ اتر جائے
جو نیند آنکھوں میں آجائے لمحہبھر کے لئے
یہ کس نے روک لیا ہے فلک پہ جانے سے
بھٹک رہی ہیں دعائیں میری اثر کے لئے
مجھے یقین ہے دیکھوں گا اپنی آنکھوں سے
چراغ دل کو جلایا ہے جس سحر کے لیے
حقیقت اس کو کہوں یا گماں کہوں ذیشان
وہ آئے تھے میرے گھر را لمحہبھر کے لئے

****

آرزو مہک۔ حیدر آباد

ٹوٹ جاتا ہے میرے سر پے مصیبت کا پہاڑ
جب بھی گرتا ہے دل و جاں پے اذیت کا پہاڑ

صرف کہنے کو ہی تنہائی خلا جیسی ہے

سچ تو یہ ہے کہ بڑا ہوتا ہے خلوت کا پہاڑ
تب سمجھ آیا مجھے بغز و حسد کا مطلب،
جب بھی نزدیک سے دیکھا کبھی نفرت کا پہاڑ
تیرے چپ رہنے سے دل میں کہیں اک شور اٹھا
گفتگو کرنے سے جگنے لگا لذت کا پہاڑ

کس سے سمجھوں میں بھلا اور کسے سمجھاؤں
لوگ تیار لیے پھرتے نصیحت کا پہاڑ
لاکھ کوشش کی مگر پھر بھی نہیں ہو پایا
اب سمبھالے نہ سمبھلتا ہے یہ چاہت کا پہاڑ
میرے والد نے بتایا ہے کہ بچ کے رہنا
'آرزو' اچھا نہیں ہوتا مصیبت کا پہاڑ

****

شیز اجلالپوری

حسن کیا چیز ہے ادا کیا ہے
گر نہ ہو عشق تومزہ کیاہے
جاں پہ بن آئی یہ محبّت کی
ابتدا ہے تو انتہا کیا ہے
اوب جاتا ہے جلد منظر سے
اے مرے دل توچاہتا کیاہے
رب سلامت رکھے تری آنکھیں
اس کے آگے یہ آئینہ کیا ہے
جھوٹ،مکروفریب،بغض حسد
ایک انساں میں دیکھ کیا کیاہے
بنت حوّا پہ ہی ہے فرض حیا
ابن آدم یوں دیکھتا کیا ہے
بات کرتے ہو ہم سے غیروں کی
یہ بتا دو تمہیں ہوا کیاہے
عشق کو مت برا کہو،شیزا،
یہ برا ہے تو پھر بھلا کیا ہے

****

عرفان صدیقی

میرے ہونے میں کسی طور سے شامل ہو جاؤ
تم مسیحا نہیں ہوتے ہو تو قاتل ہو جاؤ
دشت سے دور بھی کیا رنگ دکھاتا ہے جنوں
دیکھنا ہے تو کسی شہر میں داخل ہو جاؤ
جس پہ ہوتا ہی نہیں خون دو عالم ثابت
بڑھ کے اک دن اسی گردن میں حمائل ہو جاؤ
وہ ستم گر تمہیں تسخیر کیا چاہتا ہے
خاک بن جاؤ اور اس شخص کو حاصل ہو جاؤ
عشق کیا کار ہوس بھی کوئی آسان نہیں
خیر سے پہلے اسی کام کے قابل ہو جاؤ
ابھی پیکر ہی جلا ہے تو یہ عالم ہے میاں
آگ یہ روح میں لگ جائے تو کامل ہو جاؤ
میں ہوں یا موج فنا اور یہاں کوئی نہیں
تم اگر ہو تو ذرا راہ میں حائل ہو جاؤ

****

ذیشان مراد علیگ -رامپور،اُترپردیش

اس کی تقدیر خود سنور جائے
جو دریار سے گزر جائے
ہم اگر دیکھ لیں محبت سے
رنگ رخسار کا نکھر جائے
جھوٹ اک لفظ بھی نہ بولوں گا
سچ کے بدلے میں چاہیں سر جائے
میں تو منزل پہ جا کے ٹھہروں گا
جس کو جانا ہو اپنے گھر جائے
عشق کے تیز بہتے دریا میں
جس کا جی چاہے وہ اتر جائے
ہر طرف رہزنوں کا پہرا ہے
آدمی جائے تو کدھر جائے
اس منافق دیار میں ذیشان
زندگی کس طرح ٹھہر جائے

****

فرح شاہد -دوبئ

اپنے حصے کے ستارے بانٹ دوں
روشنی کے استعارے بانٹ دوں
بس یہ خواہش ہے تمھارے پیار میں
ڈوب کر تنکے سہارے بانٹ دوں
آخری حل ہے بقا کی جنگ میں
غیرتوں کے کچھ شمارے بانٹ دوں
کتنا مشکل تھا جدائی کے سبب
پیار کو پاؤں یا پیارے بانٹ دوں
مجھکو کانٹوں سے ہے رغبت اس لیے
پھول جتنے ہیں میں سارے بانٹ دوں
سائیہ دیوار کیا دیوار بھی اپنی نہیں
اور ہے خواہش سہارے بانٹ دوں

****

انیس قلب بدایونی-بدایوں

کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے گزرے ہیں
تری تلاش میں ہم لامکاں سے گزرے ہیں
جنون شوق میں دیکھو کہاں سے گزرے ہیں
کہ دشت سے تو کبھی کہکشاں سے گزرے ہیں
نہ پوچھ ہم سے تو اب تو ہماری حالت کو
ترے فراق میں درد و فغاں سے گزرے ہیں
وہ مرحلے بھی ہیں گزرے یوں خستہ حالوں پر
بہاروں سے نہ کبھی ہم خزاں سے گزرے ہیں
بشر ہیں ہم تو زمانے کے اب ستائے ہوئے
کہ راہ عشق پہ ہم شادماں سے گزرے ہیں
یہ کیسا شور ہے ساری فضاؤں میں یارو
کہ لوگ سارے ہی ماتم کناں سے گزرے ہیں
وہ نام لیوا ترے جا چکے ہیں دنیا سے
جناب قلب سبھی آخر جہاں سے گزرے ہیں

****

ڈاکٹر صبیحہ ناز حسین - غازی آباد

روح کیا جسم کو ڈھکنے کی قبا بھول گئے
اب تو ہم اپنے سروں کی بھی ردا بھول گئے
دورِ ماضی میں جو منسوب رہی تھیں ہم سے
آج کیوں اپنی وہ ہم شرم و حیا بھول گئے
کیوں نہ پھر اپنے اشاروں پہ نچائے دنیا
ہم انا دار ہی جب اپنی انا بھول گئے
ایسے الجھے ہیں زمانے کے مسائلمیں ہم
کون ہے غیر تو ہے کون سگا بھول گئے

خود کے کردار کی جب کر نہ سکے رکھوالی
آنکھ بچوں سے ملانے کی ادا بھو لگئے
آیئے پا سکھکچھ دیر گلے شکوے ہوں
آپ سے لوگ ہی کیوں رسمِ وفا بھول گئے
ہم نے جس دنیا کو سمجھا ہے صبیحہ سب کچھ
یہ بھی ہو جائے گیا کروز فنا بھو لگئے

****

نثار احمد نثار سرگودھا پاکستان

نصیحتوں کا تری دل میں گھر رہے نہ رہے
مرے خیال میں رخت سفر رہے نہ رہے
تمام پنچھیوں کی فکر شبنمی کر دو
یہ ڈر ہے اب کہ وجود سحر رہے نہ رہے
میں تجھ کو تجھ سے خبر دار کرنے آیا ہوں
نہ جانے پھر مجھے اپنی خبر رہے نہ رہے
مری تڑپ ہے نمایاں لہو کے چھینٹوں سے
در قفس پہ مرا بال و پر رہے نہ رہے
امیر شہر کو ہے وسعت محل سے غرض
کسی غریب کا بستی میں گھر رہے نہ رہے
یہ دل ہوا کسی ساکن خیال کے تابع
تغیرات کے عالم میں سر رہے نہ رہے
نثار فکر میں ہوں گھر میں رہنے والوں کی
ہماری دربدری پر نظر رہے نہ رہے

****

مونیکا منتشا -دہرادون،اتراکھنڈ

یہ دل کی لگی ہے تصور سے اگے
عجب بے خودی ہے تصور سے اگے
اثر جانے کیسا دکھائے گی اس پر
دعا جارہی ہے تصور سے اگے
جو ہے دفن دل میں وہ رہنے دو یوں ہی
مری خامشی ہے تصور سے آگے
مری ہم کلامی میرے حال تک ہے
مگر خامشی ہے تصور سے اگے
زباں پر دعا دل میں نفرت لیے ہیں
یہ کاریگری ہے تصور سے اگے
سنبھالو چمن من تشاد شمنوں سے
فضا نفرتی ہے تصور سے اگے

****

نور جمشید پوری

چاہت تھی دل کو جیسی وہ موسم ملا نہیں
پودا زمین چھوڑ کے رہتا ہرا نہیں
ہوتی گئی طویل غموں کی سیاہ رات
امید جس کی دل کو تھی، سورج اگا نہیں
کوشش تمام عمر ہی کرتے رہے مگر
کہہ سکتے جس کو گھر وہ ابھی تک بسا نہیں
حالانکہ سنگ زار ہی راہیں ملیں مگر
ان آبلوں کو پاؤں کے میں نے گنا نہیں
جس طرح چاہے وقت مجھے آزمالے تو
کیونکہ ابھی تلک تو ترا دل بھرا نہیں
کہتے تھے پاس پاؤ گے جب بھی پکار لو
آواز دے کے دیکھا، کسی نے سنا نہیں
اے زندگی تو لے لے کوئی امتحان اور
میرے لئے یہ مرحلہ کوئی نیا نہیں
نظروں کی بے رخی سے بھی اشکوں کا آبشار
بھرتا رہا ہے آنکھوں میں لیکن بہا نہیں
مر مر کے یوں تو روز ہی جینا پڑا مجھے
ہے شکر میرا حوصلہ اب تک مرا نہیں
دشوار راستوں کو بھی ہنس کر کیا ہے طے
رب ساتھ تھا اسی لئے دل یہ ڈرا نہیں
آتی ہیں کب فرازیاں یونہی نصیب میں
سمجھو نہ بخت طوفاں سے میرا لڑا نہیں
آئے نہ زندگی میں کبھی وقت وہ مری
جس لمحہ مرے ساتھ ہو ماں کی دعا نہیں
چاہت میں نور کی اسے کب تک جلاؤ گے
یہ دل ہے میرا دیکھو ناں، کوئی دیا نہیں

****

نظم

جگدیش پرکاش

میرے الفاظ میں خوشبو ہے تری یادوں کی
میرے اظہار میں ہے رنگ تری باتوں کا
جس کو ساون کے مہینے کی کوئی مست ہوا
میری غزلوں کے دریچے میں سجا آئی ہے
سوچتا ہوں کہ مری غزل کی چھوٹی سی ردیف
مری خموش محبت کی منادی کر دے
میرے الفاظ کبھی کھل کے گواہی دے جائیں
ہاں مجھے تم سے محبت ہے، میری جان ہو تم
میری نظموں کی منڈیروں پہ ابھرتے ہوئے الفاظ
مرے جذبات میں بھیگے ہوئے بادل کی طرح
میرے خوابوں کے دریچے میں اتر آتے ہیں
اور تیری یاد کی سرگم میں اتر جاتے ہیں
پھر انہیں رات کے دامن میں اتارو تو سہی
پیار سے مجھ کو بس اک بار پکارو تو سہی

جگدیش پرکاش
انڈیا

باقی سب افسانے ہیں

میں تقریباً ایک سال سے بے روزگار تھا مگر اچھے وقتوں میں خریدے گئے کپڑے اور جوتے، ابھی تک میرا بھرم بنائے ہوئے تھے. میں کبھی کسی علت میں مبتلا نہ رہا سوان ابتر حالات میں بھی زندگی دشوار تر نہ ہوئی. اپارٹمنٹ کے ڈھنڈر پڑے کچن میں ماربل کے لشکتے آئی لینڈ پر ڈبل روٹی، چائے یا نان اور اچار میری خالی جیب کے پردہ پوش رہے. میری محبوبہ، میری چہیتی "دلکش"، میرے گاڑھے خون پسینے سے کمائی گئی میری عزیز گاڑی لبِ سڑک اوس میں بھیگتی اور دھوپ میں جھلستی رہی. بینک میں تیزی سے گھٹتا سرمایہ مجھے "دلکش" کی متوقع جدائی سے ہراساں کر رہا تھا کہ میری چالیس سالہ زندگی میں یہی واحد مونث کا صیغہ رہی ہے۔

میرا دل دھڑکتا تو دلشاد کے نام پر تھا مگر نہ وہ میری تھی اور نہ ہی میرے لیے تھی. وہ حسن کی کل میراث سمیٹے چودھری نثار کی منگ تھی. "وہ"، وہ تھی جس پر کئی رانجھے دم ہارے بیٹھے تھے پر منہ سے بھانپ نکالے بغیر جی ہی جی میں گھٹ رہے تھے. اس ہیرے کی کنی کی جھلک سے خیرہ ہونے کے بعد گویا بصارت ہی جواب دے گئی اور ہر روپ پھیکا اور گہنایا ہی سا لگا۔

میں بڑے سے پنجاب کے چھوٹے سے دور افتادہ گاؤں کا باسی ایاز رفیق ہوں. وہی یاز وجسے پڑھائی کا خبط ملتان لے آیا. آگے اور آگے ہی بڑھنے کا جنون، مجھے ملتان سے لاہور اور بالآخر نیویارک پہنچا کر ہی دم لیا. بہت سارے دھنک رنگ خواب لیے میں 2008 میں جان ایف کینیڈی ائیرپورٹ پہ اترا. میری پاس ریزگاری قلیل پر قرضوں کی فہرست طویل تر تھی. مجھے فل اسکالرشپ نہیں ملی تھی. ابے نے جانے کس کس سے قرضہ پکڑ کر، سو سو جتن سے میرے ٹکٹ کا انتظام کیا تھا سو اب میرا دل و دماغ ہر سوچ سے مبرا محض قرضوں کا بہی کھاتہ بن کر رہ گیا تھا. پیچھے گاؤں میں میرا بڑا سا راٹبر اور میرے آگے لیے گئے قرضوں کا انبار اور ساتھ ہی گھر والوں کی جا و بیجا خواہشات میرے وجود سے آکاس بیل کی طرح لپٹی ہوئی تھیں. میں نے رہٹ میں جتے بیل کی طرح آنکھوں پہ کھوپے چڑھائے مشقت کے دائرے میں گھومتے گھومتے اپنا آپ مٹی کر لیا. ڈبل شفٹ کی مشقت نے مجھے نیویارک کی کھوج و دید سے محروم ہی رکھا اور میں یہاں ہوتے ہوئے بھی یہاں نہ تھا۔

گزرتے چھ اٹھ سالوں میں، میں نے اتنا ضرور جوڑ لیا کہ تینوں بہنوں کو بھاری جہیز سمیت عزت سے رخصت کیا جا سکا. ساتھ ہی قرضوں کی فصل مع سود کاٹ کر ابے کو تمام جکڑ بندیوں سے آزاد کر کے میں نے سکھ کی سانس بھری۔

مشکل یہ تھی کہ میں اتنے سالوں بعد بھی گاؤں کا وہی جھینپو یا زوہی تھا سو میری تنہائی ٹائم اسکوائر، بروکلن برج اور سنٹرل پارک میں دوسراہٹ کی آرزو میں خوار ہوتی رہی. میری کالی بھونرا آنکھوں نے کچھ گوریوں کو میری جانب ملتفت بھی کیا مگر میں معاشقے کی ابتدائی منزل پر ہی گھبرا کر پلٹ آتا، شاید میں اکیلا رہتے رہتے اتنا اکیلا ہو چکا تھا کہ دوئی اور شراکت مجھے خوفزدہ کرتی تھیں۔

اماں، ابا کے گزرنے پر وطن گیا اور مٹی کی امانت مٹی کے سپرد کر کے پھر بن باس کاٹنے لوٹ آیا. ان دونوں کے جانے کے بعد وطن لوٹنے کی ہمت اور چاہ دونوں ہی نہ رہی، وجہ میری تینوں بہنوں کا غدر تھا. وہ تینوں اپنی اپنی سسرال میں اپنا نمبر بنانے کے غرض سے مجھے وہیں کہیں کھپانے کی سر توڑ کوششوں میں آپس میں کھپ ڈالے بیٹھی تھیں. سو میں نے بھی بلی کا بکرا بننے کے بجائے ATM کارڈ بنے رہنا ہی مناسب جانا۔

2023 میرے لیے بڑا سخت رہا کہ ڈاؤن سائزنگ کی پھیر میں آیا اور ایسا آیا کہ مجھے بے روزگار ہوئے سال سے اوپر ہو چلا ہے. میں اب سنجیدگی سے کوئی بھی اوڈ جاب قبول کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ یہ اچھوتا خیال میرے ذہن میں آیا اور میں رسک لینے پر کمربستہ ہوا. ویسے بھی داؤ لگانے کو یا ہارنے کو میرے پاس کچھ بچا ہی کب تھا. میرا خود کو دیا گیا یہ آخری چانس تھا، آر یا پار ورنہ اسٹار بک یا سیون ایلیون میں روزگار کے مواقع تو تھے ہی. میں نے نئے سرے سے اپنا لیونگ روم ٹھیک کیا، اسے مزید پودوں اور چھوٹے سے مصنوعی آبی چشمے سے مزین کر کے پر سکون گوشے میں ڈھال دیا۔ یہی گوشہ اب میرا آفس، میرا متوقع روزگار. میں نے فلم انجمن کا معروف گانا

زخمِ دل کی دوا خریدیں گے

گیسوؤں کی گھٹا خریدیں گے

آپ فرمائیں کیا خریدیں گے!

گنگناتے ہوئے نیٹ ورکنگ کے ذریعے اپنے کام کی تشہیر شروع کر دی. ایک ہفتے تک سوائے معمولی انکوائری کے اور کچھ نہ ہوا. کسی نے دفتر میں جھانکا بھی تو محض ابتدائی معلومات کی حد تک ہی۔ دسویں دن سہ پہر ڈھلے بارش کے پہلے قطرے کی مانند ایک ضعیف خاتون، مارتھا تشریف لائیں. وہ متواتر چار پانچ روز تک آتی رہیں، ظاہر ہے ستر سالوں کی داستانِ الم تھی کوئی پل دو پل کی بات نہیں. میں نے اپنی کلائنٹ کی تواضع گرما گرم کافی اور خستہ بسکٹ سے کی اور اسے ایک معقول معاوضے کے عوض اپنا کان و کندھا دان کیا کہ میں دکھوں کا سوداگر ہوں اور گوش بر آواز. اب میرا کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے کہ میں اس بے حس اور کٹھور دنیا میں بنی آدم کے الم کو سنتا ہوں. ان کے لیے اپنا کان و کندھا فراہم کرتا ہوں۔

وقت تیزی سے بدلتا ہے۔ نئی نسل کے آنے سے نئی صبحیں جنم لیتی ہیں۔ پرانے اور بوسیدہ خیالات ختم ہو جاتے ہیں۔ نئی نسل کبھی کبھار صرف ماضی کی بوسیدہ رسوم کو ہی نہیں بلکہ درخشاں روایات کو بھی کندھوں سے اتار پھینکتی ہے۔

صدیوں کا سفر ایک طرف اور نئی صدی کی ایک دہائی ایک طرف تھا۔ نئی جنریشن نے ایک ہی جست میں وہ سب عبور کیا تھا جیسے انسان نے صدیوں کی ریاضت سے حاصل کیا تھا۔ ٹیکنالوجی کی اس دنیا میں پرانے خیالات، اور پرانے انسانوں کی کوئی جگہ نہیں تھی لیکن وہ ساتھ گھسٹ رہے تھے۔ نئی نسل نے ہر چیز کے معنی تبدیل کر دیئے تھے۔ وہ مختصر مدت کے عادی اور اسیر ہو گئے تھے وہ نصیحت اور واعظ بھی تیس سیکنڈ سے زیادہ سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔ کتابوں کا ان کی زندگیوں سے رشتوں جتنا تعلق باقی تھا بس وہ کتابیں پڑھتے تھے جن سے مالی منفعت حاصل ہو سکتی ہے۔

وہ روایات و اقدار سے باغی تھے۔ ان کو گاؤں کی پگڈنڈی، شہر کی تنگ گلیاں، نہر کا کنارہ، جنگل کی سیر، یہ سب دورِ قدیم کی ہولناک رسومات لگتی تھیں۔ وہ کتاب اور کتاب دوستی جیسے لفظوں سے آشنا نہیں تھے۔ وہ لائبریریوں کے مقاصد کو سمجھنے سے قاصر تھے انہیں یقین تھا کہ قسمت کتابوں سے نہیں بدلتی۔ اسی دور میں اختر حسین بوڑھا ہو کر پہنچ گیا تھا۔ وہ باکمال شاعر تھا اور جاندار نثر نگار۔ اس نے اپنی جوانی میں کئی تصانیف محبان ادب کو سونپی تھی۔

وہ کتابوں کے اندر کھو کر بڑا بنا تھا اس وجہ سے وہ سمجھتا تھا کہ علم ادب میراث نہیں ہے۔ یہ کوئی کھیل نہیں ہے نہ تجارت۔۔۔ یہ تو اس کو ملتی ہے جس کے دل اور وجود میں سرایت کر جائے۔ اس کے بچے بھی نئی نسل کے شانہ بشانہ تھے۔ حالات غربت سے کچھ ہی اوپر تھے۔

اختر نے اپنی کوشش کی تھی۔ وہ اولاد کو ہر سکھ دینا چاہتا تھا مگر اولاد اس سے خوش نہیں تھی۔ اختر کے باپ نے اسے کچے مکان میں پالا تھا لیکن اختر نے اپنی اولاد کو ان کی زندگی میں دو گھر بنا کر دیئے تھے۔ اولاد یہ سمجھتی تھی کہ اگر ان کا باپ کتابوں کے صفحات کالے نہ کرتا تو ان کی زندگی قدرے بہتر ہو سکتی تھی۔ وہ کچھ خاص پڑھ بھی نہیں سکے اور پھر وہ یوٹیوبر بن گئے۔ وہاں وہ وہی کرتے جو رواج اور چلن تھا۔ ایک ہی رات میں کروڑوں کمانے کا جنون اور آگے بڑھنے کا شوق۔

گھر میں لائبریری ختم ہوئی تو ایک اسٹوڈیو بنا۔ اختر بستر مرگ پر تھا جب اس کے سامنے کتابوں کو ردی کے بھاو بیچا گیا۔ اختر کو لگا اس کی اولاد نے اس کا ماضی حال اور مستقبل ردی کی نذر کر دیا ہے۔ اس کی 66 سال کی زندگی کا کل اثاثہ چند ہزار کا بکا۔ کمرہ خالی ہوا تو ایک شاندار اسٹوڈیو بن گیا۔

اختر کو معلوم تھا کہ وہ اپنا سب کچھ کھو چکا ہے وہ بھی ایک اسٹوڈیو کی راہ میں رکاوٹ ہے۔اس کا کمرہ خالی ہوتا تو شاید کتابیں بچ جاتیں لیکن اس کی کمزور سانس تھم نہیں رہی تھی۔وہ نئی نسل سے ہار گیا تھا۔پھر وہ اکیلا تھوڑی ہارا تھا۔انسان کی تاریخ ہار گئی تھی۔نئی نسل کے پاس کوئی ماضی نہیں تھا بلکہ ان کے پاس تو شاید کوئی مستقبل بھی نہیں تھا بس ایک دوڑ تھی اور سب اس کا حصہ تھے اور اس کی کوئی منزل نہیں تھی۔انسانیت انسان ضمیر رواج ماضی رویات یہ سب جدید دنیا میں ختم ہو چکا تھا۔

اختر حسین کو مرتے ہوئے یقین تھا کہ وہ کامیابی کو نہیں پا سکا۔ پچاس کتب لکھ کر وہ صرف ردی کا چند کلو وزن بڑھا سکا تھا۔

بتول نے اپنے لکھے ہوئے میسج پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی تھی۔۔۔ کئی الفاظ اسے سخت اور جھوٹے لگے تھے مگر اس نے انتہائی طیش میں آکر سینڈ کی کو پریس کر دیا تھا۔۔

ثمرہ نے انتہائی غصے میں سبزی بنانا شروع کی تھی مگر جونہی وہ پیاز، ٹماٹر، ادرک اور آلوؤں کو اپنا شکار بنا کر سارا زور صرف کرتی گئی اُسے محسوس ہوا کہ غصے کی شدت میں کمی آرہی ہے۔۔۔اُسے برتن اور سامان پٹخنا انتہائی ناپسند تھا اس لیے اُس کا غصہ دیر سے اترتا اور شدید غصہ میں بھی وہ کبھی چیزیں اٹھا اٹھا کر مارنے پر نہ اُترتی تھی۔۔۔

اماں " !زوبیہ نے ثمرہ کو مخاطب کیا تھا۔۔۔۔

"ہوں " !! وہ سر جھکائے آلو کاٹتی رہی۔۔۔۔

" آلو بن رہے ہیں کیا؟ " تو اور کیا مرغ مسلم بنالوں جو تمہارے باوادے کر گئے ہیں " ۔۔۔۔ ثمرہ نے پھاڑ کھانے والے انداز میں جواب دیا تھا اور زوبیہ اپنا سا منہ لے کر چلی گئی تھی۔۔۔اکثر لڑکیاں ثمرہ کا غصہ فرو کرنے کے لئے زوبیہ کو بھیجا کرتی تھیں ۔چھوٹی ہونے کی وجہ سے تھوڑی لاڈلی تھی وہ---

مگر آج ان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اماں اصلی والے غصے میں ہیں اسی لئے زوبیہ کی بھی دال نہیں گل سکی۔۔۔۔

" آپا!!اب میں نے نہیں جانا۔۔۔مجھے ایک دم یہ لگا کہ اماں مجھے چھری ہی نہ دے ماریں۔۔۔ "زوبیہ نے رابعہ سے کہا تھا۔۔۔"

کیا ہو گیا ہے ماں ہیں کوئی قصائی تو نہیں " ہانیہ بولی تھی۔۔۔تینوں کو ہنسی آگئی۔۔۔۔۔۔

اف!! کیا منظر کھینچا ہے ۔۔۔۔قصائی زوبیہ کی کھال اتار رہا ہے۔۔۔۔اب بوٹیاں بنا رہا ہے۔۔۔

اف کیا نرم نرم لذیذ گوشت بن رہا ہے۔۔۔۔

رابعہ کی اس منظر کشی پر ہانیہ کا قہقہہ نکل گیا اور زوبیہ منہ بنا کر وہاں سے چل دی تھی۔۔۔۔۔۔

ان تینوں کو کھی کھی کرتے دیکھ کر ثمرہ کا غصہ مزید کم ہو گیا تھا اور وہ اپنا لڑکپن یاد کر کے مسکرانے لگی تھی اس صورت حال کو محسوس کر کے سامنے کمرے میں بیٹھی بتول بی بی کے سینے پر سانپ لوٹ گئے تھے---

احسان اللہ صاحب اور ثمرہ نے دو سال پہلے بڑے چاؤ اور ارمان سے حازم کی شادی کی تھی جو کہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا---احسان اللہ کا پراپرٹی کا بزنس اچھا چل رہا تھا اور حازم نے تعلیم مکمل کر کے باپ کو جوائن کر لیا تھا---

حازم سے چھوٹی ان کی اوپر تلے کی تین بیٹیاں تھیں جو کہ ابھی پڑھ رہی تھیں

ثمرہ ایک سمجھدار عورت تھی اور اس نے پہلے دن سے کوشش کی کہ بہو کے ساتھ اس کا برتاؤ اپنائیت والا ہو---- گو کہ وہ چاہ کر بھی اس کی ماں تو نہیں بن سکتی تھی مگر پھر بھی اس کا رویہ انتہائی مثبت اور دوستانہ تھا---بہو بھی جی جی کرتی اس کی کہی ہر بات کو مانتی----تو گھر کے ماحول میں جیسے امن و آشتی گلے ملتی نظر آتی تھیں---

تینوں بہنیں اکثر آپس میں کھسر پھسر کرتی پائی جاتی تھیں ثمرہ ان کا سلوک اتفاق دیکھ دیکھ کر جیتی تھی---

اس وقت بھی وہ تینوں کھل کھل کر کے ہنسی تھیں تو لاؤنج میں ثمرہ کے اندر کہیں اطمینان کی لہریں دوڑنے لگی تھیں اور اس نے دیکھا کہ بتول جلے پیر کی بلی کی طرح کچن سے پانی لے کر اپنے کمرے میں گھس گئی تھی اور ٹھاہ کی زوردار آواز سے دروازہ بند ہوا تھا---اس کے تناؤ بھرے چہرے سے ثمرہ کو کچھ عجیب تو لگا مگر پھر بھی وہ سر جھٹک کر اپنے کام میں لگ گئی تھی

"اماں!!"ہانیہ نے آہستہ سے اسے پکارا تھا

جی بیٹا

ایک بات بتانی تھی آپ کو--- ثمرہ نے ہانیہ کی سنجیدگی کو محسوس کر کے اس کی طرف دیکھا تھا وہ واقعی سنجیدہ بھی تھی اور تھوڑا ڈری ہوئی تھی--

کیا بات ہے بیٹا؟

"آپ کے کمرے میں چل کر بات کر لیں" ہانیہ کی آواز اور پست ہو گئی تھی---

"جلدی بتاؤ بیٹا میرا تو دل گھبرانے لگا ہے---

"کل جب آپ بازار گئی تھیں نا!! تو بھابھی نے بھائی سے کہا کہ کچن میں کام کر کر کے میری تو کمر دکھنے لگی ہے"----

ثمرہ نے چونک کر ہانیہ کی طرف دیکھا ۔

"آپ نے میاں بیوی کی باتیں سنیں؟"اس نے خفگی سے کہا

"نہیں اماں! وہ دونوں لاؤنج میں ہی بیٹھے ہوئے تھے بھائی نے کہا تو یہ تینوں کیا کر رہی تھیں؟ بھابھی نے بیچارہ سی شکل بنا کر کہا" ان کا کیا قصور ہے جب آپ کی اماں نے کہا ہی مجھ سے تھا تو"----

اماں!! سالن آپ بنا کر گئی تھیں---آٹا زوبی نے گوندھا اور روٹیاں آپا نے بنائیں ۔

تو بھابھی کی کمر کیسے دکھ گئی پھر؟؟

بات تو ہانیہ کی سو فیصد درست تھی مگر ثمرہ کو اپنے بیٹے سے انتہا درجے کی محبت تھی----

"چلو بیٹا! وہ اپنے شوہر کو بتا رہی تھی آپ کو سنی ان سنی کر دینی چاہیے تھی"---- اس نے گویا مٹی ڈالتے ہوئے کہا تھا

جب بھی لڑکیوں اسے کوئی بات بتاتیں تو وہ اسی طرح بات کو دبا دیتی تھی کیونکہ اسے گھر کا سکون بہت عزیز تھا اور وہ ہر حال میں اسے قائم رکھنا چاہتی تھی----

لیکن گھر کا سکون کبھی بھی ایک فرد کے احسن رویے سے قائم نہیں رہ سکتا اس کے لیے سب کو اپنا اپنا کردار ادا کرنا پڑتا ہے----

"یہ کس نے کہا"ثمرہ نے تڑپ کر رابعہ کی طرف دیکھا تو تینوں لڑکیاں گڑبڑا گئیں

"وہ--وہ"---سدا کی صلح جو رابعہ کی زبان لڑکھڑا گئی

"اماں بھابھی نے فون پر اپنی ممی سے کہا"

"تو تم نے کیوں سنی ان ماں بیٹی کی بات" ثمرہ غصیلے لہجے میں بولی

"کیااماں!! آپ ہر بات پر ہمیں ڈانٹنے لگ جاتی ہیں---جب بھی آپ کہیں جاتی ہیں بھابھی یہ ساری باتیں ہمارے سامنے بیٹھ کر کرتی ہیں" ہانیہ پھوٹ پڑی تھی--- ثمرہ کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا----

وہ جان گئی ہیں کہ ہماری باتوں کی کوئی حیثیت نہیں اس لیے وہ بے دریغ ہمارے سامنے جھوٹ بھی بول لیتی ہیں اور منہ بھر بھر کر اپنی ممی کو بھی ہر بات نمک مرچ لگا کر بتاتی ہیں----

ہانیہ سب سے زیادہ بہادر تھی اس نے کھل کر ساری صورتحال ماں کو بتادی تھی----

ثمرہ کو اس بات کا یقین تھا کہ اس کی بیٹیاں جھوٹ نہیں بولیں گی اور الزام تراشی تو کسی صورت نہ کریں گی----

لیکن اسے اس بات کی سمجھ بھی نہیں آرہی تھی کہ بتول یہ سب حرکتیں کرے گی کیوں؟ جبکہ ان کے ہاں سارے معاملات اچھے چل رہے ہیں-

احسان اللہ صاحب اور حازم ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور ان دونوں کی آواز بہت ہلکی تھی--- ثمرہ کو اس پوشیدہ کانفرنس پر حیرت تو ہوئی تھی مگر وہ پرسکون نظر آنے کی کوشش کرنے لگی تھی----

رات جب سونے لیٹے تو وہ منتظر رہی کہ احسان اللہ ابھی بتاتے ہیں کہ دونوں باپ بیٹے میں کیا بات ہو رہی تھی مگر احسان صاحب کمر موڑ کر موبائل سرچنگ کرنے لگے

تو ثمرہ سے رہا نہ گیا ۔

"حازم کیا بات کر رہا تھا شام کو آپ سے ؟"

احسان صاحب کا ہاتھ سرچ کرتے کرتے رکا

"وہ----کچھ خاص نہیں---ایک کلائنٹ کا مسئلہ تھا"

ثمرہ نے بے یقینی سے شوہر کی طرف دیکھا

جس کا چہرہ کہہ رہا تھا کہ وہ غلط بیانی کر رہا ہے ۔

"مجھے نہیں لگتا کہ وہ کلائنٹ کی بات تھی" ثمرہ نے خلاف عادت کریدا---

"تو پھر کیا وہ تمہاری اور لڑکیوں کی شکایتیں لگا رہا تھا؟" احسان صاحب نے چشمے کے اوپر سے بیوی کو گھورا تھا---جو کہ ان کے اس جملے پر ہی حیران پریشان رہ گئی تھی" ہائیں!! میری اور لڑکیوں کی شکایتیں ؟؟؟ کیا مطلب ؟"

"پوچھ تو ایسے ہی رہی ہو بھئی----کہانا!! کوئی خاص بات نہیں ہے"----احسان صاحب نے حتمی انداز میں کہہ کر کروٹ بدل لی تھی

ثمرہ سوتی جاگتی کیفیت میں تھی کہ اچانک اس کے موبائل پر میسج کی بپ ہوئی ۔

اس نے چونک کر دیکھا تو بتول کے نمبر سے ایک میسج تھا اس نے کھولا تو لکھا تھا ۔

"بڑی مشکل سے حازم کو سمجھا پائی ہوں کہ اس کی اماں اور پھاپھے کٹنی بہنوں نے میرا جینا حرام کیا ہوا ہے---آج اتنی پمپنگ کی کہ حازم اپنے باپ کو ڈرائنگ روم میں لے کر جا بیٹھا----اب اللہ جانے! دونوں میں کیا گٹ مِٹ ہوئی ہے----حازم تو غصے میں یہ کہہ کر دفع ہو گیا ہے کہ دوستوں کے ساتھ ہے رات لیٹ آئے گا---اور اس کا میسنا باپ جا کر بیوی کے چرنوں میں بیٹھ گیا ہے---دیکھیں اب اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے-

--میری تو جان عذاب میں ہے اس گھر میں"---

پاگل نظر آنے والی وہ منگتی جسے سب " سبھائی "کہتے تھے گود میں بچے کو اٹھائے ہوئے فقیرنیوں کے اس ٹولے میں موجود ہوتے ہوئے بھی غیر موجود تھی۔بظاہر تو وہ ان سب کی ساتھی تھی لیکن اس کا غیر اہم وجود دوسری گداگر عورتوں کی طرح اس کے ہونے کی کوئی گواہی نہیں دیتا تھا کیوں کہ اس کی طرف سے نہ کوئی صدا تھی نہ کوئی ندا،نہ دعا نہ ہی کوئی بددعا،بس وہ بڑی بڑی کالی آنکھوں سے چپ چاپ آس پاس کا طواف کرتی تھی، کبھی کسی سے کچھ نہ مانگا اگر کسی نے کچھ دے دیا تو شکریے سے لے لیا۔خاص طور جب کچھ کھانے کو ملتا تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک کوند جاتی ایسے لگتا جیسے اک عرصے سے بھوکی ہے۔ایکدم کسی نہ کسی گھر کی چوکھٹ پر بیٹھ کر جلدی جلدی روٹی کے ٹکڑے نگلنے بیٹھ جاتی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد قمیض اٹھا کر بچے کو دودھ پلانے لگتی اس بات سے بے نیاز کہ کون وہاں سے گذر رہا ہے یا اسے دیکھ رہا ہے اس وقت تو اس کی کل کائنات وہ گود کا بچہ تھا جس کے سر کے بالوں کو سہلاتے ہوئے،پیار کرتے ہوئے سبھائی جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتی تھی۔سب اسے پاگل کہتے تھے لیکن مجھے اتنی صابرین گداگرنی منگتیوں کے پورے گروپ میں اور کوئی نہیں نظر آئی۔

میں جیسے ہی اسکول سے واپس گھر میں داخل ہوتی تو اکثر سبھائی مجھے سیڑھیوں پر میری دادی" بھاگل "کی طرف سے دیئے ہوئے چاول کھانے میں مگن ملتی میری دوسری بہنیں اس پاگل فقیرنی سے بات کرنا تو درکنار دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتی تھیں لیکن میری نگاہ جب بھی اس کی طرف جاتی وہ ہمدردانہ نظر بھانپ کر مسکرا دیتی میں بھی جوابی مسکرا کر اشارے سے حال چال پوچھ لیتی تھی، تھکے ہارے اسکول سے آتے تھے بات کرنے کا وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔پر ایک دن بچے کو گود میں نہ پا کر میں نے پوچھا۔

"سبھائی آج بچے کو نہیں لائیں؟"

میرے استفسار پر اس کی آنکھیں ابل پڑیں آنسوؤں کی لڑی لگ گئی روتے ہوئے کہنے لگی،" کل سے بخار میں پُھنک رہا ہے پیسے نہیں ہیں جو دوائی لوں"

دادی نے اسے جو چند سکے دیئے وہ ڈاکٹر کی دوائی کے لیئے ناکافی تھے۔میرے پاس اسکول کے جیب خرچ میں سے کچھ روپے بچت میں تھے۔میں جلدی سے اپنی چھوٹی سی ڈبیا سے وہ پیسے امی کی آنکھ بچاتے ہوئے نکال لائی،جب اسے لا کر دیئے تو تشکر آمیز بھیگی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے دوپٹے کے پلو میں باندھنے لگی۔میں دل ہی دل میں دُعا کرنے لگی کہ اللہ میاں اس کا بیٹا ٹھیک کر دے۔چند دن گذرے سبھائی کی غیر موجودگی مجھے کھلنے لگی ایک دن میں نے ان عورتوں سے پوچھ لیا میری بہنیں مسکرا کر آپس میں کہنے لگیں کہ اس کو تو ہر وقت پاگل فقیرنی یاد ہے۔میں نے ان سب کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ماسی دہنی پر آنکھیں جما دیں کہ کوئی صحیح جواب ملے۔وہ آہستہ سے کہنے لگی" بیٹا،سبھائی کا بچہ فوت ہو گیا ہے۔اب

جھونپڑی میں اکیلی پڑی ہوئی ہے کہتی ہے اب کس کے لیئے مانگنے جاؤں جس کی خاطر جاتی تھی وہ ہی چلا گیا۔ کوئی نہ کوئی اسے روٹی پانی دے جاتا ہے ہر وقت بیٹے کی یاد میں روتی رہتی ہے"!

تھوڑے ہی دنوں میں ہندستان اور پاکستان کے درمیان 1971ع کی جنگ چھڑ گئی۔ ہمارا گاؤں ڈیپلو بارڈر کے نزدیک ہونے کی وجہ سے حملے کی زد میں تھا اکثر رات کو انڈیا کے بمبار طیارے فضاؤں میں اڑ کر لوگوں میں ہراس پھیلاتے تھے اِکادکا کوئی بم بھی گرتا تھا جو ریت میں دب کر ناس ہو جاتا۔ بلیک آؤٹ، بمباری کا خوف، برادری کے بڑوں نے ملکر فیصلہ کیا کہ اس وقت ہمارے گھر محفوظ نہیں ہیں اس لیئے خاص طور پر عورتیں اور بچے محفوظ مقامات پر منتقل کرنے چاہیں جلدی سے سب میمنوں کو اطلاع کر دی گئی ایک ہفتے کے اندر کیکڑوں/لاریوں کا بندوبست کیا گیا رات کے اندھیرے میں تین تین گاڑیاں عورتوں، بچوں اور ضروری سامان کے ساتھ نواں کوٹ روانہ کی گئیں۔ وہاں سے آگے پھر لوگ جھڈو، میر پور خاص، حیدر آباد، کراچی منتقل ہوئے جہاں پہلے سے ان کی کچھ رشتے دار موجود تھے۔ یا کچھ فیملیز کے مرد نوکری کے سلسلے میں یا لڑکے تعلیم کی وجہ سے موجود تھے پھر وہ گھر وہی پر آباد ہوئے۔ ہم لوگ بھی میر پور خاص میں آکر سیٹل ہوئے۔ اس نقل مکانی میں ڈیپلو بھرا پرا شہر جیسے ایک دم جیسے ویران ہو گیا۔ اپنے جنم بھومی سے اس طرح بے دخل ہونے کو ہمارے ذہنوں نے بڑی مشکل سے تسلیم کیا، کچھ فیملیز جنگ ختم ہونے کے بعد ڈیپلو واپس بھی گئی لیکن زیادہ تر لوگ شہروں میں ہی رہے۔ جنگ کی افراتفری، نقل مکانی، میر پور خاص میں نیا محلہ، نیا اسکول، نئے ماحول میں خود کو ضم کرتے ہوئے سبھائی کا خیال میرے دل سے ہی جیسے اتر گیا۔

بھائی اقبال احمد کی شادی کے سلسلے کی وجہ سے آٹھ سالوں کے بعد 1979ع میں ہم سب کا ڈیپلو جانا ہوا بڑے لوگوں کا چھوٹا سا شہر ڈیپلو اب بھی ویسا ہی تھا۔ جیسا پہلے تا رات کو ہی سب کو خبر ہو جاتی تھی کہ آج رات کی لاری میں شہر سے کون کون سے خاندان آئے ہوئے ہیں اور کل کی لاری میں کون کون تھر سے شہر جا رہا ہے۔ سبھائی کو بھی پتہ لگا کہ قاسمانی خاندان میں شادی ہے اور یہ لوگ سب یہاں پر اتوار کو آرہے ہیں، مجھ سے ملنے کے لیے آ پہنچی اندر داخل ہو کر اماں کو مبارکباد دینے کے بعد جیسے ہی مجھ پر اس کی نظر پڑی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی میرے پاس آئی ہاتھ میں پکڑی ہوئی پوٹلی سے چھوٹا شاپر نکال کر مجھے تھمایا، بولی،

"جب سے تمہارے آنے کا سُنا بڑے دل سے یہ سوغات (جس میں سونف سپاری، الائچی، کھوپرا، وغیرہ تھے) بنائی ہے"

میں ہڑبڑا گئی منگتی فقیرنی سے ہاتھ ملانا اس کا تحفہ لینا گھر میں موجود عورتوں کی معرفت جگ ہنسائی کروانا تھا لیکن میں رہ نہ سکی میں نے اس کا تحفہ قبول کیا اور کچھ روپے اس کی مٹھی میں تھما دیئے، تحفہ فقط قبول نہیں کرنا تھا پر اس کی ایک اور فرمائش تھی کہ میں سونف سپاری کو اس کے سامنے کھاؤں اور داد بھی دوں تاکہ اس کی لائی ہوئی سوغات کو قبولیت کا شرف حاصل ہو۔ اب یہ میرا امتحان تھا پر کیا کرتی دل تو اللہ کا گھر ہے جس کو میں توڑنا نہیں چاہتی تھی سو اس کا دل رکھنے کے لیئے میں نے اس سوغات کو کھول کر منہ میں ڈالا، سبھائی کی آنکھوں میں محبت اور شکرانے کے جو جذبے تیرنے لگے وہ وہی تھی جو پہلی دفعہ اس کے بیٹے کے لیئے میری ہمدردی کرنے پر نظر آئے تھے۔ میں سوچ میں پڑ گئی،

"کیا پیار اور انسانیت کی زبان سے آشنا سبھائی" پاگل "ہے یا پاگلوں کی اِس دنیا میں" ہوشمند۔

بارش تھی کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ تین دن کی مسلسل بارش نے جل تھل ایک کر دیا تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ کچروں کے وہ ڈھیر جن سے کچرا چن کر وہ اپنے اور اپنے بچوں کے لیے دو وقت کی روٹی کا انتظام بہ مشکل کر پاتی تھی اب اس قابل نہ تھے کہ اس کا اور اس کے بچوں کا پیٹ بھر سکتے۔ کل رات سے بچوں نے کچھ نہیں کھایا تھا وہ خود بھی بھوک سے نبرد آزما تھی۔ اس کی نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اٹھتیں جیسے رازقِ کائنات سے شکایت کر رہی ہوں کہ اے رزق تقسیم کرنے والے تو نے تو ہر حال میں رزق دینے کا وعدہ کیا ہے پھر میرے بچے کل رات سے بھوکے کیوں ہیں؟ ان کے حصے کا رزق کہاں ہے؟ آسمان پر بجلی زور سے کڑکی جیسے اس کے اس خاموش احتجاج پر اپنی ناراضی کا اظہار کر رہی ہو۔

بارش میں ایک بار پھر شدت آگئی اور اس کی سوچ کا دھارا بارش کے پانی کے ساتھ ماضی کی یادوں میں بہنے لگا۔ ساون ہی کا مہینہ تھا اور ایسی ہی مسلسل بارش، ایکمرے کے کچے مکان کی چھت کئی جگہوں سے ٹپک رہی تھی۔ اندھیرا چھا چکا تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں وہ کمرے میں پڑی اکلوتی چارپائی پر بیٹھی اپنی چھے ماہ کی بیٹی کو چھاتی سے لگائے دودھ پلا رہی تھی۔ اس کا دو سالہ پہلوٹی کا بیٹا برابر میں لیٹا گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کی بے چین آنکھیں بار بار دروازے کی طرف اٹھتیں۔ اسے اپنے خاوند کا انتظار تھا جو باڑے میں گھساز مینیدار کی بھینسوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔

آسمان پر بجلی کڑکی تو اس کا دل دہل گیا۔ اس نے خوف زدہ نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ لبوں پر بے اختیار وہ تمام دعائیں جاری ہو گئیں جو اس کے حافظے میں محفوظ تھیں۔ اس سے پہلے کہ اس کی دعائیں آسمان تک پہنچتیں، آسمانی بجلی اس کے خاوند پر موت بن کر گری اور اس کا نشیمن اجڑ گیا۔

گاؤں والوں نے بڑی مشکل سے اس کے مجازی خدا کو گیلی مٹی کے سپرد کیا۔ برسات کی رم جھم میں اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے لیکن ان آنسوؤں کو پونچھنے والا اب کوئی نہ تھا۔ چند دنوں بعد ہی زمیندار نے بھینسوں کی دیکھ بھال کے لیے نیا آدمی رکھ لیا جسے رہنے کے لیے مکان کی ضرورت بھی تھی۔ خاوند کی موت کا غم ابھی کم نہ ہوا تھا کہ اسے چھت چھن جانے کے خوف نے آگھیرا۔ زمیندار نے خود کو دین دار ثابت کرنے کے لیے، نیکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اتنی مہربانی کی کہ اسے عدت پوری ہونے تک مکان میں رہنے کی اجازت دے دی۔

عدت پوری ہونے کے بعد اسے زمیندار کا دیا گیا مکان خالی کرنا پڑا۔ شوہر کی وفات کے بعد وہ بے آسرا ہو چکی تھی۔ اس کے پاس سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ وہ مایوسی کے عالم میں اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لیے نکلی۔ کہاں جائے؟ کس سے مدد مانگے؟ کون ہے ایسا جو اسے پناہ دے سکے؟ اس کا شوہر یتیم خانے میں پل کر جوان ہوا تھا۔ شادی کے وقت اس کا بھی اپنی ماں کے سوا دنیا میں کوئی اور رشتے دار نہ تھا۔ شادی کے صرف ایک سال بعد وہ بھی انھیں چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔

کہاں جائے؟ کس سے مدد مانگے؟ وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو گئی لیکن اسے اپنے سوالوں کا کوئی جواب نہ مل سکا۔ آخر کار مایوس ہو کر اس نے بچوں سمیت ریل کیپٹڑیوں کا رخ کیا تاکہ زندگی کے اس دردناک عذاب سے چھٹکارا پا سکے۔ وہ اپنے دونوں بچوں کو لے کر ریل کی پٹڑیوں پر جا بیٹھی اور موت کا انتظار کرنے لگی۔

لیکن موت کا تو وقت معین ہے۔ ہماری خواہش کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو، موت وقت سے پہلے نہیں آتی۔ اس سے پہلے کہ ریل گاڑی موت کا پیغام لے کر آتی، مائی جیراں زندگی کی آس بن کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ " خدا نے زندگی دی ہے تو اس کی قدر کر۔ " مائی جیراں نے اسے سمجھایا۔ اپنے لیے نہیں تو ان بچوں کے لیے جی۔ مجھے دیکھ میرا تو کوئی بھی نہیں اس دنیا میں لیکن پھر بھی جی رہی ہوں۔ کچرا چنتی ہوں اور پیٹ کا دوزخ بھر لیتی ہوں۔ تجھے بھی روٹی مل ہی جائے گی، چل میرے ساتھ چل۔ " وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے اپنے دونوں بچوں سمیت مائی جیراں کے ساتھ چلی آئی۔ مائی جیراں تو چند ہی مہینوں میں زندگی کی بازی ہار گئی لیکن اس کی زندگی کی گاڑی چل پڑی۔

روٹی کے لیے کچرا چنتے اسے پانچ سال ہو چکے تھے۔ زندگی کی بنیادی سہولیات سے محروم ہونے کے باوجود ان پانچ سالوں میں اس کے بچے کبھی بھوکے نہ سوئے تھے لیکن کل رات ان پر یہ افتاد بھی ٹوٹ پڑی۔ اپنی مخصوص گھن گرج کے ساتھ، سیٹی بجاتی ریل گاڑی قریب کی پٹڑیوں پر سے گزری تو وہ چونک پڑی اور اپنے خیالات کی دنیا سے نکل آئی۔ شام ہونے کو آئی، لگتا ہے آج پھر بچوں کو بھوکا سونا پڑے گا، کیا کرے؟ کہاں سے ان کے پیٹ کا دوزخ بھرے؟ اس نے باہر کی جانب نگاہ دوڑائی۔ سامنے شہر کی وہ مصروف شارع تھی جس پر ہر وقت گاڑیاں قطار اندر قطار ایک دوسرے کے پیچھے رینگتی نظر آتی تھیں لیکن اس وقت یہ بڑی سڑک ایک تالاب کا منظر پیش کر رہی تھی۔ دوسرے بچوں کی طرح اس کے دونوں بچے بھی اس تالاب کے گندے پانی میں ڈبکیاں لگا کر زندگی کا رس چوسنے میں مصروف تھے کہ اتنی سستی تفریح انھیں اور کہاں مل سکتی تھی۔

بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ بھی اپنی چھوٹی سی خیمہ نما جھونپڑی سے باہر نکل آئی۔ اس کی جھونپڑی کے ساتھ اس جیسی آٹھ دس جھونپڑیاں اور بھی تھیں۔ کیا ان لوگوں کے پاس مدد مانگنے جائے؟ لیکن انکا گزارا بھی تو کچرے پر ہے، پھر وہاں سے مجھے کیا ملے گا؟ تو کیا آج پھر میرے بچے بھوکے سوئیں گے؟ یہ سوچ کر اور بے چین ہو گئی۔

جھونپڑیوں کے عقب سے ایک ریل گاڑی شور مچاتی گزرنے لگی۔ اس نے اپنا رخ ریل گاڑی کی طرف کر لیا۔ ریل گاڑی کی رفتار عام دنوں کے مقابلے میں کچھ ریل گاڑی میں بیٹھے کچھ مسافروں کے چہروں پر بے زاری تھی، شاید سفر کی مشکلات نے انھیں تھکا دیا تھا۔ کچھ مسافروں کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے شاید انھیں منزل پر پہنچنے کی خوشی تھی یا شاید اسے یوں لگا جیسے ریل گاڑی میں بیٹھے یہ ہنستے مسکراتے مسافر اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ اس کے خالی پیٹ میں اینٹھن سی ہونے لگی جیسے کوئی اپنے گیلے کپڑے نچوڑ رہا ہو۔ اس نے گھبرا کر اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا جو بارش میں بھیگ کر اس کے بدن کے ساتھ چپک سے گئے تھے۔ ریل گاڑی جا چکی تھی، اب دور تک فقط خالی پٹڑیاں اس کے سامنے تھیں۔ وہ دیر تک ان پٹڑیوں کو خالی الذہن گھورتی رہی۔ اچانک کار کے ہارن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے مڑ کر سامنے روڈ کی جانب دیکھا۔ کار میں بیٹھے نوجوان کی بھوکی نظریں اس کے جسم پر گڑی ہوئی تھیں۔ بے ساختہ اس نے اپنے جسم کو سمیٹنے کی کوشش کی جس پر موجود کپڑے بارش میں بھیگ کر اس کے جسم کا حصہ بن چکے تھے۔ وہ ننگی نہیں تھی لیکن کار میں بیٹھ کر چیونگم چبانے والے شخص کی تیز نگاہوں نے جیسے اسے ننگا کر دیا تھا۔ اس کی نگاہیں اپنے جسم کے ساتھ چپکے ہوئے کپڑوں سے ہٹ کر ایک بار پھر کار کے جانب اٹھیں۔ کھا جانے والی نظروں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انگلی کے اشارے سے اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دی۔ وہ اس اشارے کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔ " سور کی اولاد " اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ غصے سے اس کے گیلے بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے نفرت سے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ پھر اسے اپنے بھوکے بچوں کا خیال آیا۔ دفعتاً اسے یوں لگا جیسے اس کے بچے بھوک سے تنگ آ کر ریل کی خالی پٹڑیوں پر آ بیٹھے ہیں اور کسی ریل گاڑی کا انتظار کر رہے ہیں۔ کار کا ہارن ایک بار پھر بجا۔ اس

نے بے بسی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کار میں بیٹھے شخص کے چہرے پر وہی شیطانی مسکراہٹ تھی۔ اس نے سر سے مخصوص اشارے سے ایک بار پھر اسے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ اس نے چور نظروں سے اپنے دونوں بچوں کی طرف دیکھا جو دنیا و مافیا سے بے خبر اس وقت سڑک کے گندے پانی میں ڈبکیاں لگا کر زندگی کا رس چوسنے میں مصروف تھے۔ ایسے میں انہیں اپنی بھوک بھی یاد نہ رہی تھی لیکن وہ ان کی بھوک سے غافل نہ تھی۔ وہ ماں تھی، اسے اپنے بن باپ کے بچوں کی فکر تھی۔ اسے اپنے بچوں کے لیے کھانے کا انتظام کرنا ہی تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قدم کار کی جانب اٹھ گئے۔ " چلو گی؟ " کار میں بیٹھے شخص نے اس کے بھیگے جسم پر بھوکی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ " پانچ سو روپے دوں گا۔ کار میں بیٹھے نوجوان کی آواز اسے بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔ اس نے ایک بار پھر اپنے بچوں کی طرف دیکھا جو غم حیات سے بے نیاز زندگی کا لطف اٹھانے میں مشغول تھے۔ انھیں اس وقت بھوک بالکل یاد نہ رہی تھی۔ مگر وہ ماں تھی۔ وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ " چلو۔ صرف ایک گھنٹے کے لیے اس نے بچوں پر سے نگاہیں ہٹائیں اور کار میں بیٹھے نوجوان کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ اور واپس بھی چھوڑو گے اس نے کرخت لہجے میں اپنی شرطیں بیان کر دیں۔ " ٹھیک ہے، چلو " نوجوان نے مسکراتے ہوئے کار کا دروازہ کھول دیا۔ وہ اپنے گیلے کپڑوں، بھیگے بدن اور خالی پیٹ کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی کیونکہ اس کے بچوں کی بھوک اسی طرح مٹ سکتی تھی۔

رات خاموش تھی۔ شیراز کی گلیوں میں خاموشی سرسراتی ہوئی پھیل رہی تھی۔ چاند، مزارِ حافظ پر سفید چادر کی طرح بچھا تھا۔ مرمر کے ستونوں کے سائے میں ایک جوان شخص کھڑا تھا سعود، جو اندرونی بے چینی سے بوجھل تھا۔ وہ ایران آیا تھا، محض سیاحت کے لیے نہیں، بلکہ اپنے باطن کے گم شدہ راستوں کو تلاش کرنے۔ کتابوں، نظریات، اور علوم کے انبار اس کے پاس تھے، لیکن دل کا سکون نہیں تھا۔

مزار پر بیٹھا ایک درویش طرز کا فقیر، سادہ خرقے میں، ذکر میں مشغول تھا۔ اس کا نام محمود تھا۔ آنکھوں میں عجیب نور اور چہرے پر سکون تھا جیسے صدیوں کے راز اس کے لبوں پر تھرک رہے ہوں۔ سعود نے آہستہ سے سلام کیا۔ فقیر نے آنکھیں کھولیں، مسکرایا۔

"کیا تلاش ہے، مسافر؟"

"سچ، حقیقت... اور شاید خود کو ڈھونڈھ رہا ہوں..." سعود کی آواز دھیمی تھی۔ فقیر نے حافظ کی قبر کی طرف اشارہ کیا۔

"پہلے شاعر سے پوچھ، شاید کوئی در وا ہو جائے:" فقیر

نے نرمی سے حافظ کا ایک شعر پڑھا:

دراندرونِ منِ خستہ دل، ندانم کیست

کہ من خموشم و او در فغان و در غوغاست

(میرے زخمی دل کے اندر نہ جانے کون ہے،

میں تو خاموش ہوں مگر وہ فریاد اور شور میں ہے۔)

سعود کے وجود میں لرزہ سا دوڑ گیا۔ "یہی تو ہے... اندر کوئی شور مچاتا ہے، اور میں خاموش ہوں۔" فقیر نے کہا، "تو تیار ہے؟ اندر کے سفر پر؟ یہ رستہ کتابوں میں نہیں، تنہائی میں کُھلتا ہے۔ خانقاہِ خامشی میں جا، اور خود سے آنکھ ملا۔"

چوتھے دن جب سعود اپنے نفس کے ساتھ کشمکش میں تھا، اچانک فقیر محمود حجرے میں نمودار ہوا۔ اس بار وہ خاموش نہ رہا۔ زمین پر بیٹھتے ہوئے بولا:

"سعود، تُو ہر سوال کا جواب دل سے مانگ رہا ہے۔ مگر ایک سوال ہے جو میں تجھ سے پوچھوں گا۔ کیا تُو نے کبھی محبت کی ہے؟"

سعود چونکا۔ نگاہیں جھک گئیں۔

"ہاں... ایک مشعل تھی، جو میری راتوں کو روشنی دیتی تھی... لیکن وہ کسی اور کے آنگن میں چلی گئی۔"

فقیر نے نرمی سے کہا، "سناتا جا..."

سعود کی آواز بوجھل ہوئی:

"ہم جامعہ میں ساتھ پڑھتے تھے۔ وہ میری تنہائی کی ہمراز، میری امید کا چراغ تھی۔ مگر میں وقت پر نہ بول سکا۔ جب بولا، تو دیر ہو چکی تھی۔ وہ کسی اور کی ہو چکی تھی۔ وہ مشعل... جو میری تھی، اب کسی اور کی روشنی ہے۔"

فقیر نے خاموشی سے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا:

"مشعل اگر چلی گئی، تو اندھیرا تیرا استاد بنے گا۔

محبت جو تجھے نہ ملی، وہی تجھے کامل کرے گی۔"

سعود آنکھیں پونچھتے ہوئے بولا، "میں نے اُسے پانے کا نہیں، اُسے محسوس کرنے کا ہنر سیکھا ہے۔ شاید وہی عشق ہے۔"

فقیر نے تب ایک اور شعر پڑھا حافظ کا:

دل می رود ز دستم، صاحبدلان خدارا

درد اکہ راز پنہان، خواھد شد آشکارا

(دل میرے ہاتھ سے نکل رہا ہے، اے صاحبدلو! خدا کے لیے، افسوس کہ چھپا ہوا راز اب آشکار ہونے والا ہے۔)

"یہی راز ہے، سعود۔ وہ مشعل جسے تُو نے کھو دیا، وہی تیرے اندر کی روشنی کا سرچشمہ بنے گی اگر تُو نے اُس محبت کو قربانی میں ڈھالا۔"

"شادی نہیں کی؟" فقیر نے پوچھا۔

"والدین کے دباؤ میں آ کے کی مگر اس سے دل نہیں لگا۔ اپنے گھر بھیج دیا۔"

"وہ مشعل کی روشنی کا تسلسل ہے یہ جان لے۔ محبت روپ بدل بدل کے لوٹتی ہے۔ تو اسے اپنا لے اے نادان! یہی تیری بے چینی کی اصل وجہ ہے۔"

جواب میں سعود خاموش رہا۔

فقیر کی رہنمائی پر سعود ایک پرانی خانقاہ میں مقیم ہوا شہر سے دور، ایک پہاڑی پر، جہاں صرف ہوائیں بولتی تھیں۔ حجرہ سادہ تھا: ایک قالین، ایک مشعل، اور ایک آئینہ جو ہر روز سعود کو اندر کا سب بتاتا۔ پہلا دن خاموشی میں گزرا۔ دوسرا دن سوالوں میں۔ تیسرا دن... چیخ میں۔

"میں کون ہوں؟ کیا فقط جسم؟ یا یادیں؟ یا احساسات کا مجموعہ؟" سعود آئینے میں خود کو دیکھتا اور سوال کرتا۔ ایک رات، خواب میں فقیر محمود آیا

"دل کے دروازے پر دستک دے۔ عقل نہیں، عشق سے۔"

چوتھے دن، سعود کو اندر سے ایک آواز سنائی دی۔ وہ آواز اس کے نفس کی تھی، جو خواہشات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا چیخ رہا تھا۔

"میں نے تجھے دنیا دکھائی، لذتیں دیں، پھر بھی تو راضی نہیں!"

سعود نے کہا، "تو نے فقط لمحاتی سراب دیے، میں ابدی سکون چاہتا ہوں۔"

نفس ہنسا: "پھر تُو تنہائی کیوں لے آیا؟ جا، دنیا کے میلے میں جی، جہاں خواب کم اور دھند زیادہ ہے!"

اس رات سعود نے شدید کشمکش میں دعا کی:

"اے ربِ دل، مجھے دل کی سچائی دکھا!"

ساتویں دن، آئینے میں اسے چہرے کے پیچھے ایک اور چہرہ دکھائی دیا اداس، شکستہ، لیکن سچا۔

یہ دل تھا، زخمی لیکن زندہ۔

"تو نے مجھے کب سنا؟ ہمیشہ عقل اور نفس کے بیچ گم رہا۔"

سعود رو دیا۔ "دل، اب بول، اب رہنمائی کر۔"

دل نے کہا: "عشق کر، لیکن حقیقت سے۔ تلاش کر، لیکن فنا کی رضا سے۔"

اسی لمحے، فقیر کی آواز جیسے فضاؤں میں گونجی:

"ز عشق ناتمام ما جمالِ یار مستور است

چو بود خالص از حُبش، جمالش جلوہ گر گردد"

(ہمارے عشق کے ناتمام ہونے کے باعث یار کا جمال پردے میں ہے،

جب محبت خالص ہو جائے گی تو اس کا حسن جلوہ گر ہو جائے گا۔)

گیارہویں دن، سعود کو ایک تجربہ ہوا جیسے وقت تھم گیا ہو، جیسے سب پردے اٹھ گئے ہوں۔

ایک روشنی، دل کے اندر سے پھوٹی۔ وہ روشنی روح تھی نہ جسم، نہ خیال فقط سکون۔

روح نے کہا، "تو نے سفرِ باطن کیا۔ اب تو جانتا ہے، کہ رب باہر نہیں، تیرے اندر ہے۔"

چودہویں دن، سعود شیراز واپس آیا۔ وہی شہر، وہی لوگ، لیکن ایک نیا سعود۔

مزارِ حافظ پر آ کر اس نے فقیر کو پایا۔

محمود مسکرایا: "تو جاگ گیا۔"

سعود نے کہا:

"میں نے جانا، کہ جو اندر ہے وہی اصل سفر ہے۔"

فقیر نے حافظ کا ایک اور شعر پڑھا:

خود راز غم عشقت، ای جان، چہ توان گفت

چون نیست زبان را، زان درد بیانی

(اے جان! تیرے عشق کے غم کو کیا کہہ سکتا ہوں،

جبکہ زبان کے پاس اس درد کو بیان کرنے کی طاقت ہی نہیں۔)

سعود نے فقیر کی باتوں کے بعد مزار کی خاموش فضا میں گہری سانس لی۔ اس کے دل پر چھائے اندھیرے جیسے دھیرے دھیرے چھٹنے لگے۔ وہ جان گیا تھا کہ سفرِ باطن کا اصل نتیجہ فرار نہیں بلکہ واپسی ہے۔

اسی لمحے اسے رمشہ یاد آئی۔ وہ بیوی جسے وہ اپنے دل سے دور کر چکا تھا۔ رمشہ کی آنکھوں میں چھپی ہوئی خاموشی اور ٹوٹے خواب اس کے سامنے گھوم گئے۔

سعود نے آسمان کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں کہا: "میں نے دل کا در کھول لیا ہے۔ اب میں واپس جاؤں گا... رمشہ کو اپنے گھر لاؤں گا۔ وہی میرا اصل امتحان اور میری اصل محبت ہے۔"

فقیر مسکرایا، جیسے جانتا ہو کہ یہ لمحہ ضرور آئے گا۔

"بس یہی سفر ہے، سعود۔ دل کے سچ کو دنیا کی زندگی میں اُتار دینا۔"

صبح کی اذان گونجی۔ ہوا میں روشنی کی ہلکی کرنیں پھیلیں۔ سعود نے نگاہیں جھکائیں۔ اس پر ایک نئی حقیقت منکشف ہوئی کہ سفرِ باطن کوئی الگ دنیا نہیں بلکہ اسی زندگی کے بیچ بہتا ہوا دریا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ اصل آگہی یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی تہہ میں اتر کر اُس نور کو پہچانے جو ہر شے میں پوشیدہ ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے اندر کا پردہ ہٹ گیا ہے، اور اب وہ جان چکا ہے کہ کائنات کے راز باہر نہیں بلکہ خود اس کے دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہیں۔

برسوں سے اس کی شام کے ہلکے پھیکے رنگ بے وقت ہی ختم ہو جاتے تھے اور رات کا اندھیرا بے وقت ہی شام کے ہلکے پھیکے رنگوں پر حاوی ہو کر نہ صرف اس کی شام کو اندھیر نگری بنا دیتے تھے بلکہ اس کے دل و دماغ میں بھی ایسی کال کوٹھڑی بنا دی تھی جس میں روشنی کی کوئی گنجائش نہ تھی اور پچھلے ایک سال سے وہ اس شخص کی تلاش میں ہے جس نے اس کی وہ روشنی چرا لی تھی جو اس کے دل کی کال کوٹھڑی میں آنے ہی والی تھی اور اس کی قید تنہائی سے رہائی کا سبب بننے والی تھی۔ دل پہ دستک تو وہ دے ہی چکی تھی مگر دل کا دروازہ ابھی کھولنے ہی والی تھی کہ۔۔۔۔

کہانی نویس نے لکھتے لکھتے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے قلم سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور کپ پکڑ کر کچھ سوچتے ہوئے چائے کی چسکی لی۔ تحریر میں لکھی کال کوٹھڑی نہ صرف تحریر میں تھی بلکہ کہانی نویس کا اپنا کمرہ بھی کسی کال کوٹھڑی سے کم نہ تھا کمرے میں ایک گھٹن سی محسوس ہونے لگی تو کپ لیے برسوں کی بند زنگ آلود کھڑکی کو کھولنے کی کوشش کرنے لگا تبھی ایک زوردار دھچکے سے کھڑکی کھلی تو باہر کی فضا ہچکولے کھاتی ہوئی کمرے میں آئی اور میز پر پڑے صفحات کو تازگی کی ایک جلا بخشی سارے صفحات اڑ کر نیچے گر گئے۔

باہر کا منظر بالکل صاف تھا کہانی نویس چائے پیتے کسی خیال میں گم تھا کہ اس کی نظر ایک اڑتی ہوئی چڑیا پر پڑی تو اس نے فوراً سر جھٹکا اور اڑتی ہوئی چڑیا کا مشاہدہ کرنے لگا۔۔۔

"زیادہ اونچی پرواز تو نہیں ہے۔۔۔ مگر آزادی کی اتنی سی پرواز سے بھی اڑان بلندیوں کو چھو رہی ہوتی ہے آزادی کا اصل مزہ تو اس قیدی سے پوچھو جو برسوں کال کوٹھڑی میں گزار کر آیا ہو۔۔۔ پر یار یہاں نہ تو چڑیا کا معاملہ ہے اور نہ اس قیدی کا جو آزاد ہوا ہو بلکہ یہاں تو اس قیدی کا معاملہ ہے جو کسی لڑکی کی بیوفائی کی سزا بھگتتے ہوئے کال کوٹھڑی میں بند، کسی بھٹکے مسافر کی طرح اندھیرے میں ہی اسکی تلاش میں ہے۔

چائے کی آخری چسکی لیتے ہوئے کہانی نویس نے ایک لمحے کے لیے پچھلے ایک سال کی ناکام کھوج کو اپنے اندر جھانک کر ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر اندر وہ لڑکی کیا اندھیرے میں اس کا اپنا دل بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔۔۔

"کیا ہوا اگر میرا دل کال کوٹھڑی ہے تو کم از کم دماغ تو میرا ہوادار ہے نہ۔ اگرچہ میری راہداری میں ٹیڑھے میڑھے سینکڑوں رستے ہیں مگر ہیں تو روشن۔۔۔

ہاں پچھلے ایک سال سے اس لڑکی کے ساتھ ساتھ اس شخص کی تلاش میں بھی ہوں جو سیلاب بن کر آیا اور میرا سب کچھ بہا کر لے گیا۔ کچھ لمحے کے بعد کہانی نویس نے بالکنی میں کھڑے ہو کر کھنکارا اور پھر خالی کپ میز پہ رکھنے کے بعد نیچے گرے صفحات کو اٹھا کر میز پہ رکھا، قلم پکڑا اور لکھنا شروع کر دیا۔۔

”محبت میں کھوئے ہوئے کی تلاش سے کہیں زیادہ شدت انتقام اور نفرت میں کھوئے ہوئے کی تلاش میں ہوتی ہے محبت میں بے وفائی کی آگ میں اگرچہ انسان ساری عمر جلتا رہتا ہے مگر یہ آگ رفتہ رفتہ مدھم ہو ہی جاتی ہے لیکن نفرت میں انتقام کی آگ نہ صرف شعلے بھڑکاتی ہے بلکہ اس آگ کی شدت میں نفرت کرنے والے کی روح تک جھلستی رہتی ہے“

نفرت میں اس شخص کی تلاش میں وہ کیا جھلستا وہ تو خود اندر سے کھوکھلا تھا جھلسنے کے لیے اندر کچھ تھا ہی نہیں۔۔۔

بس بہت ہو گیا۔۔

کہانی نویس غصے سے میز پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کھڑا ہوا اور بولا آج میں اس شخص کو تلاش کر کے ہی رہوں گا پھر ایک لمحہ کے لیے ساکت ہوا، کرسی پر بیٹھا اور پھر کہانی میں ایک ایسا کردار پیدا کیا کہ کہانی میں لکھے اس کردار کی سیاہی صفحے پر پھیلتی دکھائی دی۔

”یہ تم اپنے کردار سے نکلنے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟“ کہانی نویس نے گھور کر اس کردار کی طرف دیکھا جس کی سیاہی صفحے پر اب واپس سمٹ چکی تھی۔

”ایک سال سے آپ کو اس شخص کی تلاش تھی نہ جس سے بدلہ لینے کے لیے آپ نے مجھے اس کہانی میں جنم دیا تو میں اب اپنے کردار سے باہر نکل کر بات کرنا چاہتا ہوں یوں کردار میں چھپ کر میں یہ مکالمہ نہیں کر سکتا“

کہانی کے کردار نے وضاحت کی تو کہانی نویس کا پارہ چڑھنے لگا۔

”تمہاری اتنی جرات کہ تم میری اجازت کے بغیر باہر نکل کر مجھ سے مکالمہ کرو گے جو تم نے میرے ساتھ کیا میں اسی کہانی میں تمہیں ختم کر دوں گا“

کہانی نویس غصیلی نظروں سے کردار کو دیکھتے ہوئے بولا۔۔۔

”حضور! اگر اس لڑکی نے آپ کے ساتھ غداری کی تو اس میں میرا کیا قصور؟ آپ کو تو اس لڑکی کو تلاش کرنا چاہیے تھا نہ کہ اس شخص کو جس کے ساتھ کے لیے وہ آپ کی در و دیوار بھی پھلانگ گئی“

”بکواس بند کرو“ اب کی بار کہانی نویس میز پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے بولا

”تمہیں کیا لگتا ہے تم جیسے گھٹیا انسان کو ہی میں بس تلاش کر رہا تھا ارے بدبخت! اسے تو میں نے اس سمندر میں تلاش کیا جس کی لہروں کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا اور وہ ابھر کر بھی سمندر کے اندر ہی گم ہو جاتی ہیں، اس آسمان پر تلاش کیا جس پہ ہزاروں ستاروں کی بھیڑ میں وہ ایک چلتا ہوا ستارہ جس پر نظر ٹھہر سی جاتی ہے مگر اچانک وہ ستارہ غائب ہو جاتا ہے اور نظر بھٹکتی ہوئی ادھر اُدھر تلاش میں رہتی ہے یہاں تک کہ وقت کو پیچھے لے جا کر ماضی میں بھی۔۔۔ مگر وہ نہیں ملی۔۔۔۔ مگر اب تم تو مل گئے ہو نہ بتاؤ کہاں

ہے وہلڑکی؟ کہاں چھپار کھاہے اسے؟ اسسے پہلے کہتمہارے اسعامسے کردار کوہیں لکسینئے ظالمکردار کیبھینٹچڑھاوں بخودہیبتادو کہاںہے لڑکی۔۔۔؟

کہانینویسچیخکر بولا۔۔۔۔

”حضور! جس طرح آپ کا اختیار مجھ پر ہے بالکل اسی طرح اس لڑکی پہ بھی تھا وہ لڑکی بھی اسی لہر کی مانند تھی جسکا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا اور اگر وہ آپ میں گم نہیں ہوئی تھی تو ایسی غدار لہر کو آپ اٹھا کر خود ہی سمندر سے باہر پھینک دیتے“ کہانی کے کردار کی اس بات پہ کہانی نویس کا غصہ جو عروج پر تھا زوال پذیر ہونے لگا اور وہ کرسی پہ بیٹھ کر کچھ سوچتے ہوئے بے خیالی میں بولا۔ ”مگر میں اس لہر کے ارادوں سے واقف نہ تھا“

”

حضور !اب اس کہانی کو مکمل کرنے کی ضرورت نہیں آپ کی یہ حالت دیکھ کر کوئی اگلا کردار غدار نہ نکل آئے''

''گھٹیا انسان تم نے سوچ بھی کیسے لیا'' ''کہانی نویس کا غصہ پھر تیزی سے بڑھا۔

''تمہاری اوقات ہی کیا ہے ابھی میں تمہاری اس منحوس شکل پر کالک ملتا ہوں۔۔۔کب سے مجھے باتوں میں لگا رکھا ہے اگر ابھی تم نے لڑکی کے بارے میں نہ بتایا تو میں واقعی اس کہانی سے تمہارا نام و نشان ختم کر دوں گا تمہاری مختصر زندگی کا صفحہ ہی پھاڑ دوں گا''

کہانی نویس میز پہ تھوڑی دور پڑی سیاہی کی ڈبی پکڑ کر کھولنے ہی لگا کہ کہانی کا کردار بول پڑا۔

''رکیے حضور !رک جایئے بتاتا ہوں''

''اچھا بولو پھر ''کہانی نویس سیاہی کو میز پر رکھتے ہوئے بولا

''حضور !میری بات کو اپنی توجہ کا مرکز بنا کر غور کیجیے گا۔۔۔میری واقعی کوئی اوقات نہیں میں تو صرف اس گھڑی کی سوئی کی مانند ہوں جو گردش کرتی اپنا چکر مکمل کرنے کے بعد واپس اپنی جگہ پر آتی ہے ایک دائرے میں رہ کر کیسے میں اس کی حدود پھلانگ سکتا ہوں اور نہ ہی کوئی اور میری منزل ہے۔میرا راستہ آپ کی طرف ہی ختم ہوتا ہے منزل بھی آپ ہی ہیں پھر خود سوچیے میں وہ شخص کیسے ہو سکتا ہوں جس کے ساتھ وہ لڑکی چلی گئی۔۔۔''

'' حضور !جہاں آپ نے اپنا وقت اس شخص کی تلاش میں ضائع کیا وہاں آپ نے اپنی پچھلی لکھی ساری کہانیوں میں کیوں نہیں اس لڑکی کو تلاش کیا۔۔۔ہر کہانی میں، ہر جملے میں، ہر لفظ میں اسے تلاش کر کے تو دیکھیں شاید کسی لفظ میں وہ چھپی ہو ایسا لفظ یا ایسی بات جو اس کے کردار پہ آشفتہ گزری ہو بلکہ آپ اس کہانی میں تلاش کر کے دیکھیں جس کہانی کی اسے آپ نے ہیروئن بنایا تھا اور کہانی میں ہیرو کا کردار ڈالنے کی بجائے خود ہی اس کہانی کی ہیروئن کی محبت میں گرفتار ہو کر خود کو اسکا ہیرو گماں کرنے لگے۔

کہانی نویس کسی سوچ میں پڑ گیا۔۔۔۔

''حضور !اگر اس محبت کی وجہ سے لڑکی پر آپکا اختیار نہیں تھا تو اس کہانی پر تو تھا نا اگر آپکو اس کہانی کی ہیروئن سے محبت ہو ہی گئی تھی تو کہانی کو ایک نیا موڑ دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر کہانی کا موڑ واپس لے آئیں تو وہ آپ کو ضرور مل جائے گی اور آپکے اندر کی کال کوٹھڑی میں روشنی کا ایک نیا راستہ نکل آئے گا ہو سکتا اس کہانی کے موڑ کو واپس لانے سے رات کا اندھیرا اس شام پر حاوی ہی نہ ہو اور شام کے پھیکے رنگ بھی رنگدار ہو جائیں''

موڑ تو واپس لایا جا سکتا ہے مگر وقت اور وہ لڑکی نہیں کیونکہ جو زندگی سے نکال دیے جاتے ہیں ان کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھنا بڑا گوار گزرتا ہے۔

کہانی کے کردار کی اس لمبی تقریر کے بعد کہانی نویس میں احساس کی ایک لہر دوڑ اٹھی کہ اگر کہانی کی ہیروئن سے محبت ہو ہی گئی تھی تو اس محبت کو ایک ہیرو بن کر نبھاتا نہ کہ ایک لکھاری بن کر۔کہانی نویس چونکہ دو کشتیوں میں سوار تھا ایک لکھاری ہونے کی دوسرا ہیرو کا کردار نبھانے کی مگر منزل ایک ہی تھی اور وہ وہی ہوئی جس کا خون اس کی رگوں میں بچپن سے دوڑتا تھا وہ ایک اچھا لکھاری ضرور تھا مگر اچھا ہیرو نہ بن سکا۔اس سے پہلے

کہ زندگی کی تلخ یادوں کے زخم مندمل ہوتے وہ زندگی کی حقیقی کہانی سے لے کر ایک لکھاری ہونے کی جھوٹی کہانی تک ایک بار پھر سے محبت ہار بیٹھا تھا۔

کہانی نویس جلدی سے اٹھا الماری میں سب سے نیچے پڑی فائل کھینچی تو فائل میں موجود سارے صفحے نیچے گر گئے اکٹھے کرنے لگا تو آخری صفحے میں اسے وہ کہانی مل گئی جس کے اختتام میں ہیرو ہیروئن سے معذرت کرتے ہوئے یہ الفاظ بولتا ہے کہ '' حق تو یہ ہے کہ مجھ سے صحیح محبت کا حق ادا نہ ہو سکا ''اور پھر کہانی کو ایک نیا موڑ دیتے ہوئے کسی فرضی ہیرو کے ساتھ اسے رخصت کر دیتا ہے۔

آخر کرتا بھی کیا کہانی نویس حقیقی محبت کی بے وفائی نے دیوانہ بنا دیا تھا ایک کمرے میں رہتے ہوئے وہ کب تک محبت کی تلاش میں رہتا۔ زندگی کا ایک رخ جب ذہنی مریض بنا دے تو دوسرے رخ میں وہ مریض اپنے مرض کا مداوا کرتے کرتے خود ہی اس مرض سے پیچھے ہٹنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ مرض آہستہ آہستہ انسان کو اندر سے ختم کرنے لگتا ہے اسی طرح کہانی نویس بھی فرضی کہانی کی ہیروئن سے محبت نہ نبھا سکا پر اسکی تلاش اسے اندر سے مزید کھوکھلا کر گئی۔۔۔۔

چھوٹا بلو پھٹی پھٹی آنکھوں سے زمین پر پڑے شیر کو دیکھ رہا تھا جس کی کھوپڑی پر ایک بڑا سا سوراخ تھا۔ تب ہی اچانک تارا بائی نے جنونی انداز میں آگے بڑھ کر ایک بڑی سی اینٹ اٹھائی اور مرے ہوئے شیر کے سر پر دے مارا۔

پاس کھڑے فاریسٹ رینجرس اور پولس افسران نے دیگر گاؤں والوں کی مدد سے بمشکل اسے دور ہٹایا۔

''پچھلے ہفتے جنگل میں جس بچے کا سَر اور دایاں پاؤں ملا تھا، وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ''موہن داس نے انہیں بتایا۔

''انکل، آپ بھیڑیوں کا شکار نہیں کرتے؟ ''اچانک بلو پوچھ بیٹھا۔

''کیوں نہیں بیٹا، اگر بھیڑیا آپ پر حملہ کرے گا تو ہم اسے بھی گولی سے اُڑا دیں گے۔ ''شیر کو گولی مارنے والے افسر نے بندوق کی نال تھپتھپاتے ہوئے بلو کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

''پچھلے سال دیدی کی لاش کھیت میں پائی گئی تھی۔ ماں نے بس اتنا ہی بتایا کہ اسے کچھ بھیڑیئے اٹھا لے گئے تھے... مگر کیا بھیڑیئے صرف کپڑے کھاتے ہیں؟ ''

افسر کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

وہ تو مل بانٹ کر کھاتے ہیں... الفاظ افسر کے تالو سے چپک کر رہ گئے!

پنجرے میں بند جانور نما انسان چوکنّا، مگر انتہائی خوفزدہ نگاہوں سے، باہر کھڑے لوگوں کو دیکھتے ہوئے اِدھر سے اُدھر چھلانگیں لگانے پر مجبور تھا کیوں کہ سب کے ہاتھوں میں تیز، نوکیلی سلاخیں تھیں جسے وہ اس کے بدن میں چبھا چبھا کر لذّت کشید کر رہے تھے۔

''ارے میرا بیگ کہاں گیا؟ ''اچانک ان میں سے کوئی چلایا۔اور پھر دوسروں کو بھی احساس ہوا کہ ان کے تھیلے غائب تھے۔

سلاخیں چھوڑ، وہ انتظامیہ کو شکایت درج کرانے جانے ہی والے تھے کہ انتظامیہ کی گاڑی ان کے قریب آ کر رکی۔

''آپ گھبرائیں نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں۔ آپ بس لطف لیں اور یہ نہ بھولیں کہ آپ نے صدیوں اس کے ڈر کے سائے میں غلامی کی زندگی بسر کی تھی۔''

''لیکن ہمارے پاؤں کے جوتے بھی غائب ہیں۔ ''کسی نے توجہ دلائی، اور سب چونک کر اپنے اپنے پیروں کو تکنے لگے۔

''بے فکر رہیں۔ چور بچ کر نہیں جا سکتا۔ آپ سب یہ مرچ پاؤڈر گن لیں۔ ''اس نے ہر ایک کو مرچ پاؤڈر سے بھری ٹوئے گن تھماتے ہوئے کہا ''اور اس کی سرخ آنکھوں پر فائر کریں، یا پھر اس کے رِستے ہوئے زخموں پر وار کریں۔ ''

پھر واقعی اس کی دردناک چیخوں نے انہیں ایک سرور آگیں، لذت آمیز خمار میں مبتلا کر دیا اور... اور انہیں اپنے جسموں سے کپڑوں کے غائب ہو جانے کا بھی احساس نہ ہوا۔

زلزلے کا شدید جھٹکا لگا تو زمین لرزنے لگی۔ لوگ خوف کی وجہ سے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔

اس کا شوہر روزگار کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا. ان کے بوسیدہ گھر کی دیواروں میں زلزلے کی وجہ سے دراڑیں پڑ گئیں. پڑوسن نے اس سے کہا کہ وہ اپنے بچوں کو لے کر میدان میں آجائے کیوں دوسرے جھٹکوں کا خدشہ تھا۔

اس کے چار بچے تھے. دو بیٹے اور دو بیٹیاں. چھوٹی بیٹی پیدائشی معذور تھی۔ اسے دیکھ کر اس کا دل کڑھتا رہتا تھا کہ ایک تو بیٹی اور وہ بھی معذور. یہاں تو اچھی بھلی لڑکیوں کی شادی نہیں ہو پاتی، اس زندہ لاش کا کیا ہو گا؟ وہ کب تک اسے سنبھالے گی؟ اس کے بعد کون اسے سنبھالے گا؟ تب اس کے ذہن میں ایک ظالمانہ سوچ نے جنم لیا.

"کیوں نہ معذور بچی کو وہیں چارپائی پر پڑا رہنے دوں. اب زلزلے کے دوسرے جھٹکے میں ہمارا بوسیدہ گھر گر جانے کا خدشہ ہے... تو پھر... وہ ملبے تلے دب کر ختم ہو جائے گی... اس کی موت کا سبب تو زلزلہ ہو گا ناں"...

وہ اپنے صحت مند بچوں کو لے کر دروازے کی طرف دوڑی تو ایک درد بھری صدا نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا. اس نے مڑ کر دیکھا، چارپائی پر لیٹی معذور بچی اپنے بازو اٹھا کر اسے پکارتی ہوئی رو رہی تھی. اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے علاوہ حسرت اور خوف کے گہرے سائے تھے.

اس کی مامتا ایک جھٹکے سے جاگ پڑی اسے جیسے ہوش آگیا. دوڑ کر بچی کے پاس گئی، اسے گود میں اٹھایا اور سب کو لے کر کھلے میدان میں آگئی.

کچھ دیر نہ گذری تھی کہ زلزلے کا دوسرا جھٹکا لگا اور اس کا بوسیدہ گھر اس کی بے رحم سوچ کی طرح زمین بوس ہو گیا۔

آفیس میں دل وجان سے محنت وہ کرتی رہی مگر باس اہمیت مس ایکس کو دیتا تھا۔
اس نے مس ایکس کی غلطیاں گنوائیں مگر اعلیٰ کارکردگی کا ایوارڈ اس کے بجائے مس ایکس کو دیا گیا۔
وہ اپنے میرٹ پر فخر کرتی رہی مگر مس ایکس حیرت انگیز طریقے سے ترقی کرتی گئی۔
باس اسے روبوٹ سمجھ کر کام کا بوجھ اس پر ڈالتا گیا جبکہ مس ایکس اپنے خوبصورت لباس، میک اوور اور اداؤں کی وجہ سے باس کو متاثر کرتی رہی۔
وہ برسوں سے اسی عہدے پر فائز تھی جبکہ مس ایکس ترقی کرتے کرتے اس سے بھی آگے نکل گئی۔
دراصل اسے ترقی کرنا آتی ہی نہیں. وہ تو اتنی سادہ ہے کہ اب بھی حیران ہو کر سوچتی ہے کہ۔۔
"آخر مس ایکس میں ایسی کون سی خوبی ہے جو مجھ میں نہیں....؟

کیا تم جانتے ہو ۔۔

جنگ بچوں کا کھیل نہیں

یہ دوبدو لڑائی نہیں

جہاں طاقتور کی جیت اور کمزور تہ تیغ ہو جاتا تھا ۔

اب تو جنگیں ایٹمی ہتھیاروں, کیمائی بموں اور اور بغیر سپاہیوں کے بھی لڑی جاتی ہیں ۔

جس میں غریب, معصوم, بوڑھے بچے سب مارے جاتے ہیں ۔

کیونکہ اب جنگ میں کوئی اصول کوئی قانون نہیں چلتا ۔

اب صرف طاقتور کا سکہ چلتا ہے ۔

وہ طاقتور جس کے پیچھے کئی بڑی طاقتیں کھڑی ہیں ۔

کمزور کی تباہی کا تماشا دیکھ کر نظر بچا لیتی ہیں ۔

اپنے ہتھیاروں کو بیچ کر ان کے قابل عمل ہونے کا نظارہ دیکھتی ہیں

دو ہمسایوں کو مل کر نہیں رہنے دیتیں

یہی وہ طاقتیں ہیں جو چھوٹے ملکوں کو

تباہ کر کے

اپنے بڑے پن کو رعونت سے تسکین پہنچا کر

جھوٹ کی مرہم پٹی سے بے وقوف بنا کر

اقوام عالم کی تنظیم کا علم لہراتی ہوئی

امداد کے ڈونگرے برسا کر احسانِ عظیم کرتی ہیں

کاش تم لوگ سمجھ لو

ان عالمی شیطانوں کی چالوں کو

گر سمجھ لو تو انھیں ناکام کر کے
امن کے نغمے گنگنا لو, اپنے شکوے ختم کرو
شیطان کو غالب نا آنے دو
یہ بھی ایک جہاد ہے

ہر سال مون سون کا سیزن ایسا ہی ہوتا تھا بارش موسلا دار اور ٹپ ٹپ ٹپکتی چھت کبھی ایک جگہ برتن رکھتی کبھی دوسری جگہ۔
اس سال کا مون سون کا سیزن کچھ زیادہ ہی طاقتور تھا بارشیں تھیں کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں چھت تو پھر بھی دلاور خان نے ٹھیک کروالی تھی مگر گھر کے اندر پانی بھر رہا تھا، اسکے ہاں چوتھے بچے کی آمد تھی تین بیٹیاں اسکو صلواتیں سنانے کے لیے، کافی تھیں وہ دعا کر رہی تھی اللہ بیٹا دے تو دلاور خان کو سکون ہو، بیٹے کے صدقے بیٹیوں کو بھی اچھی زندگی ملے۔
آج تو برسات نے نا رکنے کی قسم کھالی تھی ساتھ ہی دریا کا پانی بھی چڑھ رہا تھا پڑوسی نے اس کڑے وقت میں بدلہ لیا تھا اور دریاؤں میں پانی چھوڑ دیا، جیسے ہی پانی خطرے کے نشان سے اوپر ہوا سائرن بجنے لگے، دلاور خان بیوی بچوں کے ساتھ محفوظ مقام پر جانے کے لیے نکل پڑا، بیوی کو درد شروع ہو گئے وہ درد چھپاتی اسکے ساتھ چلتی رہی سرکاری اسکول میں پناہ ملی، درد بڑھے تو اس نے دلاور کو کہا، اس پریشانی میں کہاں ڈاکٹر کہاں ہسپتال ، ارگرد لوگوں نے اپنی زنانیوں کو دلاور کی بیوی کی مدد کو بھیجا، ایک بزرگ مائی نے ہمت کر کے بچہ پیدا کروایا، جیسے ہی بچے کے رونے کی آواز کان میں آئی وہ نیم بے ہوشی میں بولی مائی کیا ہوا ہے بیٹا، دلاور کے کان میں آواز پڑی وہ خوشی سے ناچنے لگا میرا سیلاب خان آگیا، میرا سیلاب خان آگیا، تکلیف سے نڈھال عورت کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

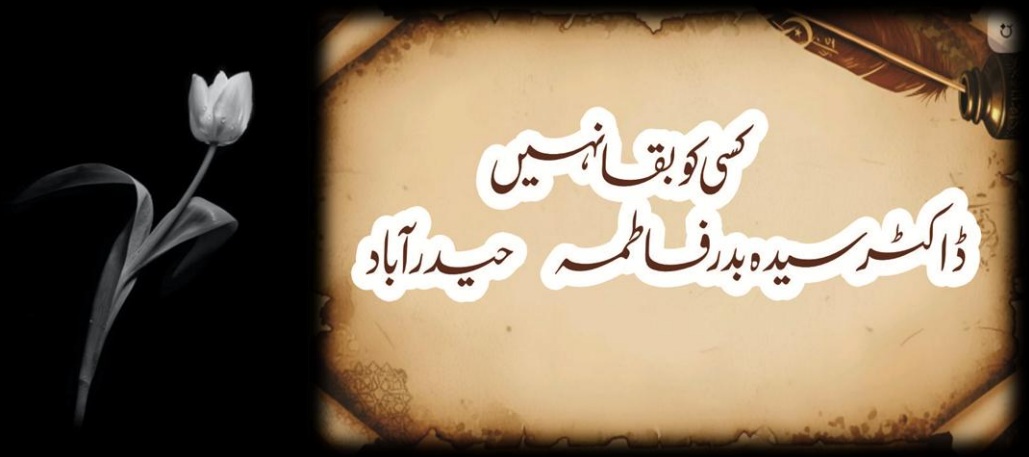

ایک ننھی سی کشتی جو ایک خوبصورت تالاب کی شہزادی تھی۔وہ روز اس تالاب کی موجوں پر کھیلتی اور اٹھکھیلیاں کھاتی اور مسکراتی تھی۔شام کی لالی اسے ممتا بھری تھپکی دے کر سلاتی، تو رات میں آسمان کی چادر اس کو اپنی آغوش میں بھر لیتی تھی۔ صبح اس کے ساتھی پرندے اپنی میٹھی چہچہاہٹ سے جگانے آتے اور وہ تالاب کی چنچل موجوں پر سنبھلتی پھسلتی کنارے اپنے دوستوں سے ملنے جاتی تھی۔

یہ تالاب ہی اس کی کل کائنات تھی۔ کنارے پر موجود لہلہاتے درخت اور چہچہاتے پرندے اس کے دوست تھے۔اور وہ اپنی اس دنیا میں خوش تھی۔

اور پھر اچانک.....ایک رات بڑے زور کی بارش ہوئی۔۔بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک سے اس معصوم کا دل لرز اٹھا۔اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی کائنات میں ایسی ہلچل مچی اور ایسی طغیانی آئی کہ وہ سنبھل ہی نہ پائی۔۔پھر۔۔۔جلد ہی تالاب کے کنول نے اس ننھی پری کو اپنی آغوش میں لے لیا۔۔مگر موجوں کا تسلسل ایسا تھا کہ وہ اس معصوم کو ان کی نرم آغوش سے بہالے گیا۔۔

آہ!! بڑی ہی درد بھری کراہ تھی جب کچھ انسانی نفوس نے اس کے بکھرے وجود کو روندا تھا۔۔۔رات اس طغیانی نے اس کشتی کے سارے وجود کو بکھیر کر رکھ دیا تھا۔اس کے تنکے ساحل سمندر پر بکھرے پڑے تھے جہاں اس کو رات طغیانی نے اپنی خوابوں کی آماجگاہ تالاب سے نکال کر اتنی دور سمندر کی گہرائی سے واقف کراتے ہوئے اور اس دنیا کی سچائی کو سمجھاتے ہوئے اسے ساحل سمندر پر لا پھینکا تھا۔

وہ ننھی جان جس نے کبھی کبھی تالاب کی کسی موج کا ہلکا سا بھی تھپڑ نہ کھایا تھا وہ سمندر کے گرداب کی نذر ہو گئی۔جو ہر روز کنارے پر موجود اپنے دوستوں کی صدا پر بیدار ہوتی تھی آج ایک ساحلی کنارے پر بکھری پڑی تھی۔۔جس کے تنکے آمد و رفت کی سہولت کے لئے روندے جا رہے تھے۔نہ ہی کوئی ساتھی پرندہ اس کے کام آسکا اور نہ ہی تالاب کے پھولوں کی نرم آغوش اسے سہارا دے سکی۔۔۔واقعی اس فانی جہاں میں کسی کو بقا نہیں۔۔۔۔۔۔

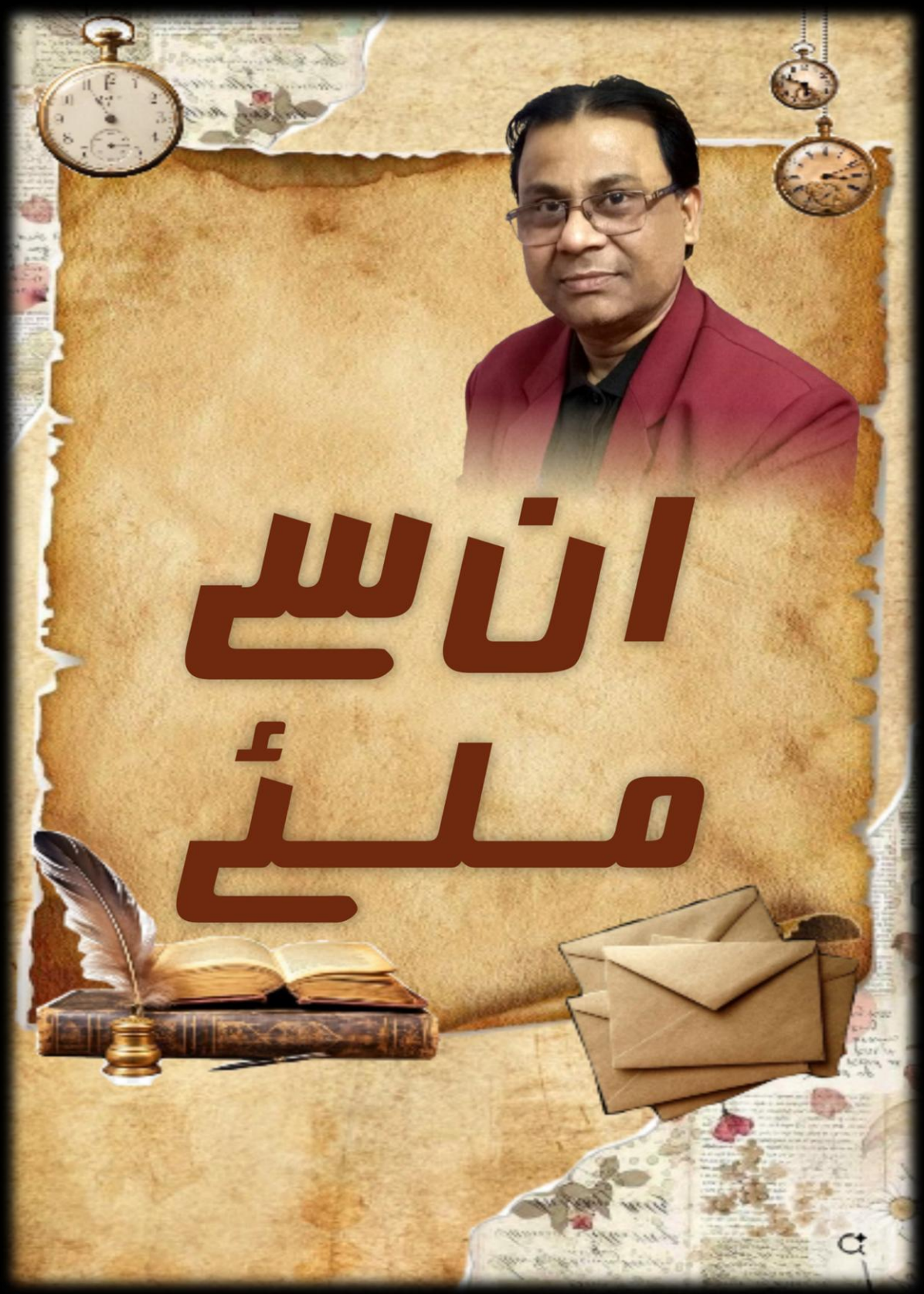
انسے
ملئے

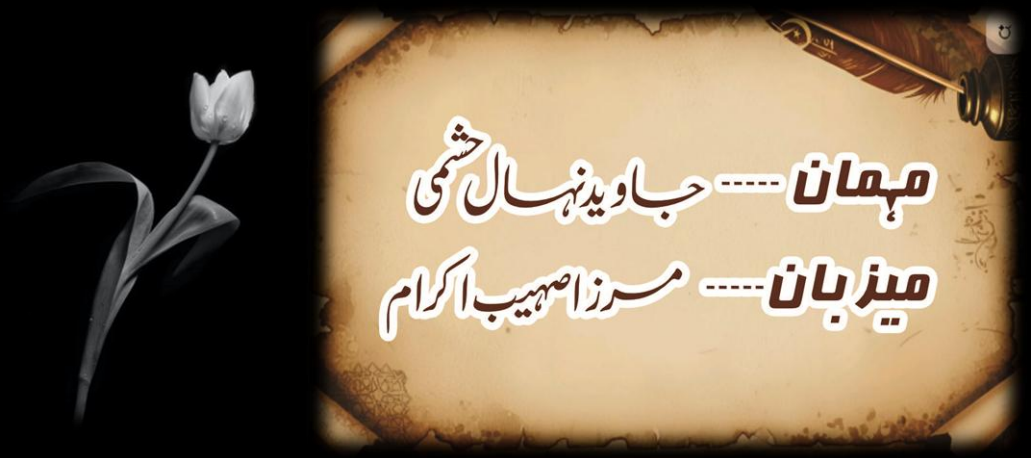

ہمارے اس سیکشن میں ملئے بنگال کے جانے مانے افسانچہ اور افسانہ نگار، انشائیہ نگار، کارٹونسٹ اور استاد محترم جاوید نہال حشمی صاحب سے مرزا صہیب اکرام کے ساتھ۔۔۔

مرزا صہیب اکرام: السلام علیکم محترم جاوید صاحب۔ امید کرتا ہوں آپ خیریت سے ہوں گے۔

میں آپ سے پہلا سوال حسب روایت یہی کروں گا کہ آپ قارئین موجِ خیال کے لیے اپنا تعارف کروادیں۔

جاوید نہال حشمی: میرا تعلق مغربی بنگال کے ضلع شمالی 24 پرگنہ سے ہے جہاں میں نے 17 مارچ 1967 کو آنکھیں کھولیں۔ میں ہندوستان کی اولین سرکاری درس گاہ، مدرسہ عالیہ (اینگلو پرشین ڈپارٹمنٹ، کلکتہ مدرسہ) میں سائنس کا معلم ہوں۔ میرا تعلق مغربی بنگال کے ایک علمی و ادبی گھرانے سے ہے۔ ابّا مرحوم محمد حشم الدین فارسی اور اردو کے ٹیچر تھے۔ انگریزی زبان و قواعد پر بھی کافی دسترس رکھتے تھے۔ ہم پانچ بھائی اور دو بہنوں میں چار ٹیچر اور دو اعلیٰ عہدے پر فائز سرکاری افسران ہیں۔ ایک طرح سے تدریس ہمارا خاندانی پیشہ ٹھہرا۔ والد مرحوم کا شمار مضافات کے استاد شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے مضافات کے کئی نئے اور پرانے شاعروں کی ذہنی آبیاری کی۔ لہٰذا ادبی ذوق بھی ہمیں ورثے میں ملا ہے۔ ادبی دنیا میں مجھے افسانہ، افسانچہ اور انشائیہ نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔

سوال: میں آپ کے خاندان اور آباؤاجداد کے حوالے سے جاننا چاہوں گا کہ وہ بنگال کی دھرتی پر کب سے ہیں؟

آپ بنگال سے ہیں تو آپ کے اجداد اردو ادب سے کس طرح جڑے اور کیا بنگالی ادب کے حوالے سے بھی کام کر چکے ہیں؟

جواب: یہ کہنا مشکل ہے کیوں کہ تین نسلوں سے تو ہم مغربی بنگال میں ہی ہیں۔ والدین سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ابّا کی طرف سے ہمارا تعلق بلیا (یو پی) سے ہے جب کہ امی کی طرف سے ہمارا خاندان اورنگ آباد (بہار) سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن ابّا ہماری زندگی میں تو کبھی بلیا نہیں گئے نہ ہی کبھی وہاں کے کسی رشتے دار کا ذکر کیا۔ ہماری ریاست میں موجود اردو/ہندی بولنے والے لوگ عموماً بہار یا یوپی سے ہجرت کر کے آئے ہوئے ہوتے ہیں .... یا تو ملازمت کی تلاش میں یا پھر مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) سے بٹوارے کے نتیجے میں۔

ہماری اسکولنگ اردو میڈیم میں ہوئی ہے۔ ابّا خود اردو اور فارسی کے استاد تھے اور جانے مانے استاد شاعر۔ البتہ ریاستی زبان بنگلہ کی اہمیت کے مدنظر والدین نے تھرڈ لینگویج کے بطور فارسی کی بجائے بنگلہ دلوایا۔ اس کا براہ راست فائدہ یہ ہوا کہ ہم تین بھائیوں کو سرکاری ملازمت حاصل کرنے میں

اس سے مدد ملی۔ میرے بڑے بھائی احمد کمال حشمی جو ایک معروف شاعر ہیں، نے مشہور بنگلہ رائٹر بن پھول کی منتخب ''گلپو کتھاؤں) ''منی کہانیوں)کا اردو میں ترجمہ کیا جسے مغربی بنگال اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے چند سال قبل شائع کیا گیا۔

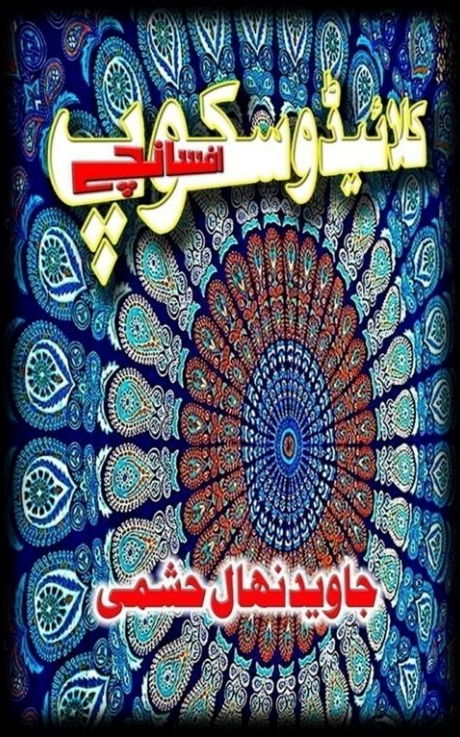

سوال: آپ کا گھرانہ ادبی ہے۔ آپ کے والد شاعر تھے آپ کے بڑے بھائی بھی شاعر ہیں۔ آپ کو ادب ذوق وراثت میں ملا ہے۔ لیکن وہ کون سا لمحہ تھا جب آپ نے یہ سوچا کہ آپ کو بھی رائٹر بننا ہے۔ اور آپ نے اپنی تعلیم کے ساتھ ادبی دنیا میں کیسے قدم رکھا؟ اس سفر کا احوال بتائیے۔

جواب: مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے اپنا پہلا افسانہ تحریر کیا اس وقت درجہ ہشتم کا طالب علم تھا۔ افسانہ نگاری کی تحریک ماہنامہ کھلونا کی کہانیاں پڑھ کر ملی تھی لیکن افسانے چھپوانے کا جوش ماہنامہ پیامِ تعلیم میں '' بچّوں کی کوششیں'' نامی کالم دیکھ کر پیدا ہوا۔

جب ہم (بڑے بھائی احمد کمال حشمی، منجھلے بھائی ارشد جمال حشمی اور میں) خود سے کہانیاں پڑھنے کے قابل ہوئے تو والد محترم نے اخبار والے کو ہدایت دی کہ وہ ہر ماہ کھلونا بھی دے جایا کرے۔ اس وقت ہم لوگ پرائمری درجات کی تعلیم کے آخری مرحلے میں تھے۔ کھلونا کا نشہ اس قدر چڑھا کہ ہر ماہ کی ۱۵ ؍ تاریخ کے بعد سے ہی اگلے شمارے کے بے چینی سے منتظر رہتے تھے۔ نیا شمارہ ملتے ہی جھپٹ کر سب سے پہلے کارٹونی کہانیاں پڑھتے تھے جن میں خاص طور سے چھوٹو اور موٹو (لاریل اور ہارڈی) ہمارے پسندیدہ کردار تھے۔ بے صبری کا یہ عالم تھا کہ دو بھائی پاس پاس بیٹھ کر بیک وقت ایک ہی کہانی پڑھنا شروع کرتے تھے اور اگر ایک، صفحہ پہلے ختم کر لیتا تو دوسرے کو اطلاع دیتا تا کہ وہ بھی جلدی کرے اور صفحہ پلٹے۔ میری پہلی کہانی '' سنہرا خواب '' ۱۹۸۱ء میں ماہنامہ پیام تعلیم میں شائع ہوئی جب میں ۱۴ سال کا تھا۔ اس کی اشاعت پر میری ذہنی کیفیت کا وہی عالم تھا جو کسی بھی تخلیق کار کی اپنی پہلی تخلیق کی اشاعت پر ہوتی ہے، خصوصاً اس کمسنی میں رسالے کی آنریری کاپی اسکول کے پتے پر آئی تھی اور چپراسی نے یہ ڈاک جماعت میں لا کر دیا تھا۔ رسالے میں اپنی کہانی دیکھ کر میری دھڑکن بڑھ گئی اور بڑی بے تابی سے اسکول کا وقت ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا تا کہ جلد سے جلد گھر پہنچ کر اپنے اس '' اعزاز '' کے بارے میں گھر کے لوگوں کو بتا سکوں۔

بعد کے برسوں میں کھلونا ناشرین کی بے توجہی کا شکار ہو گیا اور اس کے گیٹ اپ، کامکس اور کہانیوں کے معیار میں بھی گراوٹ آ گئی۔ ظاہر ہے ہماری دلچسپی بھی کم ہو گئی۔ اسی زمانے میں ہم نے پیامِ تعلیم کا سالانہ خریدار بننے کا فیصلہ کیا۔ تینوں بھائی اپنی جیب خرچ سے بچائی گئی رقم یکجا کرتے اور کمی ہونے پر والد محترم سے کچھ رقم لے لیتے اور اسے جامعہ نگر منی آرڈر کر دیتے۔ اسکول کے زمانے میں ہم تینوں نے ہی پیامِ تعلیم جم کر پڑھا اور اس میں جم کر لکھا۔ ہماری ادبی زندگی کا آغاز دراصل اسی رسالے سے ہوا۔ ہم وقتاً فوقتاً مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور دیگر اداروں کے شائع کردہ بچّوں کے ناول

بھی خریدتے اور خوب شوق سے پڑھتے تھے۔ان میں خوفناک جزیرہ، کالی دنیا، نیلی دنیا، ستاروں کے قیدی اور کرشن چندر کے لکھے بچّوں کے کئی ناول قابل ذکر ہیں۔شاید ناولوں کے اسی نشے نے ہمیں بعد میں جاسوسی دنیا کا ایڈکٹ بنادیا جس کے نتیجے میں ہم نے ابن صفی کے ہر ناول " چار چار ختم" کئے۔

اسکول کے زمانے میں لکھی گئی میری تمام کہانیوں کی اصلاح بڑے بھائی احمد کمال حشمی کیا کرتے تھے۔اس زمانے کی کہانیاں پیام تعلیم کے علاوہ نور (رامپور)، فلم ویکلی، فلم ایڈوانس، سنے ایڈوانس اور اخبار مشرق وغیرہ میں شائع ہوئیں۔

میں نے ۱۹۹۰ء تک کثرت سے کہانیاں لکھیں جو مذکورہ بالا رسائل واخبارات کے علاوہ ماہنامہ انشاء (کلکتہ)، روبی، بتول، بانو اور پرواز ادب وغیرہ میں شائع ہوئیں۔لیکن آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس تمام عرصے میں والد صاحب نے ہماری تخلیقی کاوشوں کی اصلاح تو دور، ہمت افزائی بھی نہیں کی بلکہ اکثر کہا کرتے تھے" ان سب کاموں کے لیے ساری عمر پڑی ہوئی ہے، ابھی ساری توجہ پڑھائی پر دو۔"

سوال: بہت خوب۔آپ کے ادبی سفر کی ابتدا تو بہت متاثر کن ہے اتنی کم سنی سے آغاز کیا اور پیام تعلیم سے جیسے معتبر رسالہ میں پہلی تحریر کا شائع ہونا یقیناً یادگار لمحہ ہوگا۔اسکول سے کالج کے دور تک نو سال تک اپ نے معاشرتی کہانیاں لکھیں یا ابن صفی سے متاثر ہو کر جاسوسی کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی؟

کیا اس دور کے سماجی مسائل نے آپ کی تحریروں پر اثر ڈالا تھا --

جواب: دیگر بیشتر بچوں کی طرح مجھے بھی بھوتوں کی اور پراسرار کہانیاں بہت پسند آتی تھی۔جب لکھنے کا شوق چرایا تو ابتدا میں ایسی ہی کہانیاں لکھنی شروع کیں کیوں کہ اس میں تجربے اور مشاہدے سے زیادہ تخیل کی کارفرمائی ہوتی تھی جو اس عمر میں نسبتاً آسان کام لگتا تھا۔جب شعور تھوڑا بالیدہ ہوا تو روزمرہ کی زندگی کے واقعات سے پلاٹ کشیدہ کرنے لگا۔

۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۵ء تک کے عرصے میں فکر معاش کی وجہ سے تخلیق کی رفتار دھیمی ہوگئی۔۱۹۹۵ء کے بعد تو ملازمت کی جدّوجہد میں الجھ کر ادبی سرگرمیاں پوری طرح ماند پڑ گئیں۔اس مدّت کو میں اپنی ادبی زندگی کے hibernation سے تعبیر کرتا ہوں، کیوں کہ اس دوران ذہن بیدار رہا، مشاہدے کا عمل بھی جاری رہا اور ذہن میں مختلف کہانیوں کے پلاٹس تیار ہوتے رہے جن میں سے کچھ تو پردۂ ذہن پر ہی کلبلاتے رہے اور کچھ صفحۂ قرطاس پر ادھوری شکل میں منجمد ہو کر رہ گئے۔

ملازمت کے ایک دو سال بعد جب میں نے پھر سے لکھنے کی کوشش کی تو احساس ہوا کہ اتنے طویل عرصے کے وقفے نے لکھنے کی قوت گویا سلب کرلی ہے۔اس " تخلیقی فالج " سے جانبر ہونے میں ملازمت کی جستجو کے دوران ہونے والے تلخ تجربات ومشاہدات نے کافی مدد کی جنہوں نے میرے اندر کے افسانہ نگار کو" پُنر جنم " دیا۔جستجو ملازمت کے دوران مجھے جن تلخ حقائق سے دوچار ہونا پڑا انہوں نے مجھے نا صرف ذہنی طور پر چڑچڑا بنادیا بلکہ موجودہ نظام معاشرہ سے بغاوت کردینے کے لئے اکسانا شروع کردیا تھا۔وہ تو بھلا ہو میرے اندر کے افسانہ نگار کا جس نے میرے ذہن میں اُٹھتے ہوئے طوفان کو ایک معقول outlet دیا اور مجھے گمراہ ہونے سے بچایا۔طنزیہ ومزاحیہ مضمون "ضرورت ہے " اسی دور کی تخلیق ہے جس کا ہر لفظ میرے ذاتی تجربے کی عکّاس ہے۔یہ میری آپ بیتی بھی کہی جاسکتی ہے۔

مجھے بچپن سے ہی تصویریں بنانے کا بہت شوق تھا۔ بعض اوقات تصویروں پر زیادہ دھیان دینے کی وجہ سے اکثر والدین کی ڈانٹ بھی سُننا پڑتی تھی۔ابتدا میں پورٹریٹس اور منظر کشی سے شوق پورا کرنے کے بعد میں نے کارٹونس بھی بنانے شروع کر دیئے۔پیام تعلیم میں جب پہلی بار میری کارٹونی کہانی شائع ہوئی تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی کیوں کہ اس شمارے کے اداریہ میں میری تعریف میں ایک خصوصی پیرا گراف تھا۔مدیر ولی شاہجہانپوری نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ذاتی طور پر مجھے کئی خطوط لکھے جنہیں میں کسی '' سرٹیفکٹ ''کی طرح سنبھال کر رکھتا تھا۔بہ حیثیت کارٹونسٹ ایک یا ڈیڑھ سال تک میں کامک اسٹرپس بناتا رہا۔پھر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا کیوں کہ ہائر سکنڈری (سائنس (کا طالب علم ہونے کی وجہ سے اپنے اس شوق کی تسکین میں زیادہ وقت دینے سے معذور تھا۔بعد میں اخبار مشرق) کلکتہ) میں کارٹونی کہانیوں کے علاوہ میرے بنائے ہوئے طنزیہ ومزاحیہ سیاسی کارٹون بھی چھپے جو'' پوسٹ مارٹم '' کے نام سے مستقل کالم کی شکل میں شائع ہوتے تھے۔اس کے علاوہ بچّوں کے لئے Hocus- Focus کے طرز پر'' شرارت آئینے کی '' کے عنوان سے بھی ایک مستقل کالم کچھ عرصے تک جاری رہا۔

وقتاً فوقتاً مختلف موضوعات پر سائنسی مضامین بھی لکھے۔انگریزی میں بھی دو تین سائنسی اور طنزیہ ومزاحیہ مضامین لکھے جو مختلف رسائل واخبارات میں شائع ہوئے۔اسکول کے زمانے سے ہی ڈرامہ نگاری کا بھی شوق رہا ہے۔لیکن اشاعت سے زیادہ اسٹیج کرانا مقصد ہوتا تھا جو ایک وقت طلب کام تھا۔لہٰذا بہت کم ڈرامے تخلیق کر پایا۔ہدایت سے لے کر میک اپ اور میوزک تک خود دیا کرتا تھا۔دو مزاحیہ ڈرامے '' خدا بچائے ''اور ''رجنی ''اسکولوں کے کلچرل پروگراموں میں اسٹیج کئے گئے۔خصوصاً'' رجنی ''تو مرشد آباد میں اس قدر مقبول ہوا کہ دو ایک کلبوں،اسکولوں اور تنظیموں کے علاوہ بی ایس ایف والوں نے بھی میرے ڈرامے اسٹیج کرانے کی فرمائش کر ڈالی۔'' رجنی ''نے کلکتہ کے مسلم انسٹی ٹیوٹ میں مدرسہ عالیہ کے زیرِ اہتمام انٹر اسکول مقابلے میں پہلا انعام بھی جیتا۔یہ ڈرامہ مولانا آزاد کالج (کلکتہ) میں نئے سیشن کی شروعات میں لگاتار دو سال یعنی دوبارا اسٹیج کیا گیا۔حال ہی میں اتر دیناجپور کے ایک ہائی اسکول میں بھی ٹیچرس ڈے کے موقعے پر اس کا ایک کامیاب شو کیا گیا۔

سوال: آپ کا سفر دل کش اور بھرپور رہا۔آپ کے اندر ایک تخلیق کار چھپا ہوا تھا جو مختلف اوقات میں نئی شکلوں سے باہر آتا رہا۔آپ کہانی کار سے کارٹونسٹ بنے۔ہار رسے مزاح کی طرف راغب ہوئے۔اس پورے دور میں ایک تخلیق کار کے طور پر کبھی یہ طے کر پائے تھے کہ آخر آپ کا حتمی میدان کیا ہوگا؟اور آپ کو کہاں ٹھہر جانا چاہیے۔میں پچھلے سوال سے ایک حصہ پھر دہراؤں گا کہ آپ نے جاسوسی ادب کا ذکر کیا۔آپ نے ابن صفی کو پڑھا اور محسوس ہوتا ہے کہ ان کو چاہا بھی۔آپ ابن صفی سے کس خاص وجہ سے متاثر ہوئے اور کیا آپ نے جاسوسی ادب میں بھی طبع آزمائی کی؟

جواب: یہ درست ہے کہ مجھے بیک وقت کئی میدانوں میں دلچسپی تھی۔بچپن میں کہانیاں لکھنے کے علاوہ ڈرائنگ اور واٹر کلر پینٹنگ سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔پینسل اسکیچ میں مشہور شخصیات کی پورٹریٹس اتنی بنائیں کہ آج بھی کلکتے کے کئی کلبوں،اداروں اور اسکولوں میں میرے بنائے پورٹریٹس (علامہ اقبال،مرزا غالب،مولانا آزاد،مہاتما گاندھی،سر سید احمد خان،علامہ رضا علی

وحشت کلکتوی، پروفیسر عبّاس علی خاں بے خود، علقمہ شبلی، امام خمینی، امیتابھ بچن، محمد رفیع، محمد علی کلے، فٹ بالر پیلے وغیرہ) موجود ہیں۔ لوگوں نے کہا اسی لائن میں آگے بڑھو، بہی خواہوں نے حوصلہ شکنی کی کہ اس میں کوئی فیوچر نہیں ہے۔ ابّا نے سائنس سے شادی کروادی، ادب سے معاشقہ کبھی چھوٹا ہی نہیں۔ ادب میں صنفِ افسانہ ہمیشہ سے نورِ نظر رہی۔ مگر موضوعات زیادہ تر معاشرتی رہے۔ تین چار رومانی افسانے بھی لکھے (دیوار، امیج وغیرہ)۔ جاسوسی ادب سے دلچسپی صرف پڑھنے کی حد تک تھی۔ لکھنے کی کوشش کی تو پولیس اور ملٹری عہدوں کی hierarchy کا علم نہ ہونے کے سبب ایک handicap سا محسوس ہوا اور ارادہ ترک کر دیا۔ البتہ میں ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بعد کے برسوں میں طنز و مزاح سے بڑھتے رجحان کے پیچھے بھی ابن صفی کے ناولوں میں موجود اعلیٰ درجے کے طنز و مزاح کے عناصر بھی رہے ہیں، بطور خاص عمران کے ناولوں میں۔ کسی ناول میں ابن صفی کا یہ جملہ میں آج تک نہیں بھولا" جرائم وہ ہوتے ہیں جو انفرادی حیثیت سے کیے جاتے ہیں، حکومتوں کے جرائم تو حکمتِ عملی کہلاتے ہیں"۔

ان دو اصناف (افسانہ اور انشائیہ) کے علاوہ میں نے شروع سے ہی سائنسی مضمون نگاری بھی کی ہے۔ چوں کہ اردو میں معیاری سائنسی مضامین لکھنے والے کچھ زیادہ نہیں ہیں، مجھے کئی لوگوں نے اس طرح توجہ مرکوز کرنے کی بھی صلاح دی۔ اتنے سائنسی مضامین تو ہو ہی چکے ہیں کہ ایک کتاب لائی جا سکے۔ مگر اس میں تخلیقیت عنقا ہونے کے سبب اسے "شوق" کی بجائے "ذمہ داری" کے زمرے میں رکھا۔ البتہ اظہار اثر اور سراج انور کے ناول پڑھنے کے بعد سائنس فکشن لکھنے کا شوق ضرور چرایا تھا۔ مگر ترجیحات میں کہیں نیچے تھا۔ پھر ابن صفی کے ناولوں نے اس شوق کو جِلا بخشی۔ پھر دیکھا کہ اردو میں دورِ حاضر میں سائنس فکشن نگار تقریباً نہ کے برابر ہیں اور اس کی بڑی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے تو باقاعدہ اس کا ارادہ کیا۔ اولین افسانوی مجموعے میں شامل افسانہ "Besieged" کی بحیثیت سائنس فکشن بہت پذیرائی ہوئی۔ دو سائنسی افسانچے (سائنس مائکروف) بھی زیرِ طبع مجموعے میں شامل ہیں۔ ایک ساتھ اتنے سارے "معاشقے" ممکن نہیں ہیں۔ لہٰذا سائنس فکشن کو کولڈ اسٹوریج میں ڈال کر رکھا ہے۔ فی الحال انشائیوں اور پیروڈی کے میدان میں فعال ہوں۔ افسانہ اور افسانچہ نگاری بھی ہو رہی ہے۔ تدریسی فرائض پر زیادہ توجہ ہونے کے سبب کچھ برسوں سے سائنسی مضمون نگاری کی "دوسری اننگ" کھیلنے کا ارادہ بھی کیے ہوئے ہوں۔

سوال: آپ کارٹونسٹ بھی ہیں اس طرف دھیان کیسے گیا اور اس حوالے سے آپ نے اردو میں کون سا معروف کام اور معتبر حوالہ دیکھا تھا جس کے بعد آپ نے اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ اور اپ قارئین کے لیے اس صنف کی تھوڑی وضاحت کر سکتے ہیں؟

جواب: جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں، ماہنامہ کھلونا میں کارٹونسٹ شکیل انوار صدیقی کی کارٹونی کہانیوں کے ہم دیوانے تھے، بطورِ خاص چھوٹو اور موٹو (لاریل اینڈ ہارڈی)۔ ماہنامہ نور، پیامِ تعلیم وغیرہ میں کارٹونی کہانیاں نہیں ہوتی تھیں۔ البتہ ان میں کچھ کچھ صفحات پر بچی جگہ کی خانہ پری کے لیے ڈائجسٹوں کی طرح کارٹون ضرور ہوتے تھے۔ پھر ہندی رسالے "چمپک" میں موجود کارٹونی کہانیوں نے مجھے تحریک دینا شروع کیا کہ اردو رسالوں میں اس کمی کو میں ہی پورا کروں۔ لیکن کچھ عرصے میں احساس ہوا کہ یہ بھی ایک وقت طلب کام ہے اور کوئی اخبار یا رسالہ معاوضہ دینے کو تیار نہیں۔ مفت میں ریگولر یہ کام کرنے سے تو رہا۔ لہٰذا آج بھی جب کبھی کوئی مزاحیہ یا سیاسی کارٹون بناتا ہوں تو بس اپنے شوق سے یا پھر فرصت کے اوقات دستیاب ہونے پر۔

سبکدوشی کے بعد بچوں کا رسالہ نکالنے کا ارادہ ہے۔تب ہو سکتا ہے یہ اننگ بھی دوبارہ کھیلوں۔ان شاءاللہ

سوال: آپ نے افسانچہ اور مائیکرو ف کا ذکر کیا ہے۔۔۔یہ دونوں نئی اصناف ہیں ان کی طرف آپ کیسے راغب ہوئے اور کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہی ادب کا مستقبل ہیں؟ کیا ناول اور افسانہ نگاری آہستہ آہستہ معدوم ہو جائیں گے۔ ؟؟

اور اسی پر ایک سوال اور شامل کروں گا۔ قارئین کے لیے افسانہ اور افسانچہ میں جو بنیادی فرق ہے اس کی وضاحت بھی کریں۔

جواب: میں بنیادی طور پر افسانہ نگار ہوں۔افسانچہ نگاری کی طرف راغب ہونے کے پیچھے سوشل میڈیا بطور خاص مختلف افسانچہ واٹس ایپ گروپس رہے ہیں جہاں اس کی مقبولیت دیکھتے ہوئے مجھے بھی افسانچے لکھنے کا خیال آیا۔2019 میں میرے افسانچوں کا اولین مجموعہ '' کلائیڈو سکوپ ''منصۂ شہود پر آیا۔دوسرا مجموعہ '' رانگ سائیڈ ''پریس میں جانے کو تیار ہے۔لیکن اس میدان میں کافی بھاگ دوڑ کرنے کے بعد مجھے شدت سے احساس ہو چلا ہے کہ اچھا افسانچہ لکھنا، اچھا افسانہ لکھنے سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔اس کا محدود کینوس آپ کو ہاتھ پاؤں پھیلانے نہیں دیتا، نیز قاری پر دیر پا اثر چھوڑنے کے لیے لفظوں کا انتخاب، واقعات کی ٹوئسٹ، کلائمکس میں سرپرائز کا element یہ سب اتنا آسان نہیں۔ لکھنے کو تو افسانچوں کے نام پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے جس میں ایک بڑی تعداد ایسی تحریروں کی بھی ہے جسے سرے سے افسانچہ ہی نہیں کہا جا سکتا۔ اچھے افسانچے بہت خال خال لکھے جا رہے ہیں۔ لہٰذا مجھے نہیں لگتا کہ ناول اور افسانہ نگاری کو یہ صنف کبھی ٹکر دے پائے گی۔خود آج بھی میری پہلی پسند افسانہ نگاری ہی ہے، افسانچہ نگاری کی حیثیت ثانوی ہے۔اچھی شاعری کی طرح اچھی افسانچہ نگاری کے ساتھ بھی آمد اور آورد والا معاملہ ہے۔ میں نے افسانچے لکھنا بہت کم کر دیا ہے، اور اسی وقت لکھتا ہوں جب اس کا '' نزول ''ہوتا ہے۔ہر واقعہ تصور کو متحرک نہیں کرتا، اور اس کی شعوری کوشش تحریر کو مصنوعی اور کمزور کر دیتی ہے۔

افسانہ اور افسانچہ میں سب سے بنیادی فرق تو اختصار کا ہی ہے۔باقی افسانوں کے سارے عناصر miniature شکل میں افسانچوں میں بھی پائے جاتے ہیں، بیانیہ، مکالمے، واقعات نگاری، کلائمکس وغیرہ۔البتہ منظر نگاری اور جذبات نگاری کی اس صنف میں کوئی جگہ نہیں۔ان دونوں کا کام مکالموں اور واقعات سے لیا جاتا ہے۔میں ذاتی طور پر افسانچوں میں ایمائیت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں کیوں کہ سپاٹ بیانیہ افسانچے کو معیار کی کافی نچلی سطح پر لے آتا ہے۔ تکنیکی اعتبار سے افسانچے کی جان کلائمکس میں ہوتی ہے، اور کلائمکس میں سرپرائز کا عنصر، قاری کے تصور کو فائر کر دینے یا اس کے دل میں ٹیس یا ذہن میں خلش چھوڑ جانے کی صلاحیت اسے دو آتشہ کر دیتے ہیں۔

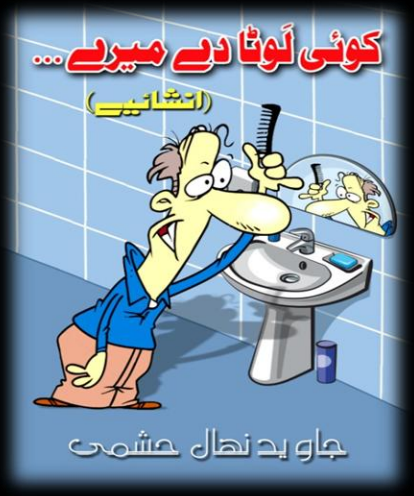

سوال: یہاں پر ہر اسی حوالے سے ایک سوال کروں گا کہ افسانہ کے ہوتے ہوئے افسانچہ کی ضرورت ادب میں کیوں پیش آئی؟

کیا یہ ایسا ہی ہے جیسے فلموں کی جگہ شارٹ موویز آ رہی ہیں یا آج ریلز کا دور دورہ ہے؟ اگر اس کی وجہ قاری کے پاس وقت کی قلت اور جلد بازی ہے تو کیا ہم خود بھی اس کے احتجاج کو تسلیم کرتے ہوئے دس لفظی بیس لفظی سو لفظی کہانیاں لکھ کر آہستہ آہستہ ناول اور افسانے کا گلا نہیں گھونٹ

رہے؟

جواب: دیکھیے، ایک افسانچہ نگار ایسے سوال کو زیادتی سمجھے گا۔ ظاہر یہ سوال کبھی نہیں کیا جاتا کہ غزل اور نظم کے ہوتے ہوئے قطعہ اور رباعی کیوں۔ بھئی سب کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ غلط فہمی دور کر لی جائے کہ وقت کی تنگی کے سبب افسانچے کی ضرورت پیش آئی۔ منٹو اور جوگندر پال کا وقت آج کی طرح وقت کی تنگی کا دور نہیں تھا۔ ہاں، یہ الگ بات ہے کہ دَورِ حاضر میں افسانچوں کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب وقت کی تنگی ہے۔ جن موضوعات پر افسانے لکھے جا سکتے ہیں، اس پر افسانچے نہیں لکھے جا سکتے۔ ٹھیک اسی طرح، افسانچوں کے موضوعات کو افسانے میں پھیلانا، وہ بھی غیر ضروری تفصیلات سے بچتے ہوئے، بہت مشکل امر ہے۔ لہٰذا وسیع و محدود کینوس کے سبب افسانوں اور افسانچوں دونوں کی اپنی الگ اہمیت ہے۔ اب رہی بات افسانچوں کی مقبولیت یا افسانوں کی جگہ لینے کی، تو دونوں کے قارئین کا طبقہ الگ ہے۔ جو افسانوں کے شوقین ہیں وہ آج بھی وقت نکال کر افسانے پڑھتے ہیں مگر افسانچوں کو منہ نہیں لگاتے، اور جو افسانچوں کے دیوانے ہیں، افسانے پڑھنے کے لیے درکار صبر و تحمل سے عاری ہیں، اور افسانوں کے ابتدائی developing اسٹیج پر ہی اکتاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ناول پڑھنے کے لیے بھی ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے جس کے لیے روزانہ یا ہفتے میں چھٹی کے دنوں میں ایک روٹین کے تحت قرأت کی جاتی ہے۔

میں ایک بار پھر کہوں گا کہ معیاری افسانچے بہت کم لکھے جا رہے ہیں اور یہی سبب ہے کہ معتبر اور سنجیدہ قارئین و تخلیق کار اس طرح توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ اشعر نجمی جیسا مدیر و تخلیق کار جو افسانچوں کا سخت مخالف ہے نے میرے منتخب تین افسانچے اپنے مؤقر جریدے ''اثبات'' میں بڑے اہتمام سے شائع کیے۔

سوال: کہا جاتا ہے یہ کتابوں سے عشق کی آخری صدی ہے۔ لیکن مغرب اور مشرق کا موازنہ کریں تو یہ جملہ کچھ اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اردو کتابوں سے عشق کی آخری صدی ہے۔ کیونکہ باہری دنیا میں تو اب بھی کتاب لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتی ہے اور درجن بھر زبانوں میں ترجمہ بھی کر جاتی ہے۔ آخر اس خطے میں جہاں آبادی کروڑوں میں ہے کتاب سے تعلق کیوں ٹوٹ رہا ہے؟ اور کیا آج کوئی طریقہ ہے کہ کتاب کو واپس مین اسٹریم میں واپس لایا جا سکے؟ اور آخر وہ کیا وجہ تھی جس نے کتاب کو مین اسٹریم سے نکالا؟

جواب: کتب بینی دراصل ایک کلچر ہے۔ یہ تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ معاشرے کی شناخت ہے۔ اس کی عادت بچپن سے لگائی جاتی ہے۔ بچوں کے رسائل اور کامک اسٹرپس کی کتابیں دے کر۔ ہم جب خود کتب بینی چھوڑ چکے ہیں تو ہمارے بچے کیسے یہ عادت اپنائیں گے؟ یقین مانیں آج بھی جن گھروں میں کتابیں صرف الماریوں میں سجاوٹ کا حصہ نہیں بلکہ ان کے مطالعہ کا ماحول بھی بنا کر رکھا گیا ہے، وہاں کے بچوں میں بھی کتب بینی کی عادت ہوتی ہے۔ اور ایک خاص بات بتاؤں؟ ہمارے یہاں کتب بینی کی عادت ختم نہیں ہوئی ہے، سرے سے پڑھنے کی عادت ہی ختم ہو گئی ہے! ورنہ پڑھنے والے تو پی ڈی ایف کی شکل میں بھی کتابیں پڑھ سکتے ہیں جو نہایت آسانی سے اور مفت یا بہت سستے میں دستیاب ہیں۔ سہولیات الگ ہیں۔ پی ڈی ایف کی شکل میں بیک وقت ہزاروں کی تعداد میں کتابیں موبائل یا لیپ ٹاپ میں رہتی ہیں اور سفر کے دوران جب چاہیں جہاں چاہیں پڑھ سکتے ہیں۔ رات کو دوسروں کی نیند خراب کیے بغیر اندھیرے میں بھی کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔ مگر کیا ایسا ہوتا ہے؟ جنہیں پڑھنے کی عادت ہے وہ کتابوں کو ہی ترجیح دیتے ہیں، آن اسکرین کسی مجبوری کے تحت ہی مطالعہ کرتے ہیں، وہ بھی زیادہ دیر تک نہیں۔

ہمیں اپنے بچوں کو ابتدائی عمروں میں الیکٹرانک گیجٹس کا استعمال محدود کرنا ہوگا اور دلچسپ رسائل مع کامکس مہیا کرنا ہوگا۔ پڑھ کر سننے سنانے کا ماحول بنانا ہوگا تب کہیں جا کر آنے والی نسل میں کتب بینی کو فروغ حاصل ہوگا۔

سوال: میں پچھلے سوال کا ایک حصہ پھر دہراؤں گا جو میرے خیال سے ادھورا رہ گیا۔ آپ نے یہ بات درست کہی ہے کہ یہاں بچپن سے کتابوں کا شوق اجاگر کرنا ہوگا۔ لیکن الیکٹرانک گیجٹس یا جدیدیت کی بات کریں تو مغرب میں ہم سے کہیں پہلے اور آگے کا ماحول ہے ٹیکنالوجی ہم تک گھِس کر پہنچتی ہے لیکن وہاں نئی نسل بھی کتاب اخبار رسائل سب کچھ پڑھ رہی۔ مگر ہماری طرف کتاب صرف پبلشر اور مصنف کے بیچ گھومتی ہے ۔ تین سو سے پانچ سو کی تعداد چھپوا کر بیچنا مصنف کے لیے جان لیوا مرحلہ ہوتا ہے۔ آخر وہ کیا وجہ ہے کہ اس پورے خطے سے کتاب اور مطالعہ اٹھتا جا رہا ہے۔

جواب: جب ہم ''کتب بینی ''کا فقرہ استعمال کرتے ہیں تو اس سے عموماً ہماری مراد '' دلچسپی '' کے لیے کتابیں پڑھنا ہوتا ہے مثلاً فکشن، شاعری وغیرہ جس کا مقصد جمالیاتی حس کی تسکین ہوتا ہے۔ تکنیکی علوم یا کورس کی کتابیں پڑھنے کو ہم '' اسٹڈی ''یا مطالعہ کہنے کے عادی ہیں جس کا مقصد جاب، بزنس، پروموشن، ترقی وغیرہ ہوتا ہے۔ مغرب میں بھی تکنیکی علوم کی حصولی کے لیے آڈیو ویزوول مواد، آن لائن ویڈیو لکچرس وغیرہ پر بہت انحصار

کیا جاتا ہے جس کے کئی فائدے ہیں جو کتابوں سے حاصل نہیں ہوتے۔ کتب بینی مغرب کے ترقی یافتہ معاشرے کے کلچر کا حصہ ہے۔ ہمارا ترقی پذیر معاشرہ ابھی ارتقاء کے اس مرحلے پر نہیں پہنچا جہاں وہ کتب بینی کی اہمیت کو سمجھ سکے یا اس کے لیے فرصت نکال سکے۔ کتب بینی کے فروغ میں کمی کا سبب صرف معاشرتی ہی نہیں بلکہ اقتصادی پسماندگی بھی ہے۔ بیداری کی کمی تو اپنی جگہ ہے ہی۔ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں بھی job-oriented ذہنیت فروغ پا رہی ہے جس کے سبب ہم ادب عالیہ کے مطالعہ کو تضیع اوقات سمجھنے لگے ہیں۔ اکثر گارجین اپنے بچوں کو شاعری اور فکش کے مطالعے سے دور رکھنے اور کورس کی کتابوں پر زیادہ دھیان دینے کی تاکید کرتے ہیں۔ ابھی آپ نے کہا تین سے پانچ سو کی تعداد میں کتاب چھپوا کر بیچنا مصنف کے لیے جان لیوا ہوتا ہے۔ کیا یہ بات سائنس، تکنالوجی، معاشیات وغیرہ کی کتابوں پر بھی صادق آتی ہے؟ بالکل نہیں۔ کتب بینی کا براہ راست تعلق اقتصادی آسودگی اور تعلیمی ترقی سے بھی ہے۔

سوال: یہاں سے اگلا سوال کروں گا کہ ماضی قریب اور ماضی بعید کی بات کریں تو آج بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں پچاس سے ستر سال قبل بھی کتب بینی مغرب کی طرز پر نہیں تھی۔ اس دور میں آنہ لائبریریاں سستے داموں تفریح کا ذریعہ تھیں اس وجہ سے نوجوان طبقہ اس سے جڑا ہوا تھا ۔ لیکن سنجیدہ ادب کے نام پر جو کلاسک کہی جاتی ہیں وہ تب بھی دو سو سے چار سو ہی چھپتی تھی۔ تو کیا یہ خیال درست ہو سکتا ہے کہ ہمارے ادبی نقادوں نے اپنی مخصوص کتب کی خاطر فکشن کے سب سے دلچسپ حصے کو نظر انداز کیے رکھا اس وجہ سے بھی نئی نسل مشہور کہانی نویسوں کے بعد کتاب سے ہی دور ہو گئی۔ اس کی ایک مثال ابن صفی کی ہوگی۔ جن کی ایک کتاب کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تک بھی بتائی جاتی ہے۔

جواب: اس ضمن میں، میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں۔ ہمارے بچپن کے دور میں، اور اس سے قبل بھی، رسائل و جرائد میں کہانیاں پڑھنے، ناول پڑھنے کا رجحان قدرے بہتر تھا۔ مگر کلاسک ادب کا مطالعہ کبھی عام نہیں ہو سکا۔ اس کی جو وجہ مجھے سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ ہم نے، ہمارے

نظامِ تعلیم نے ابتدائی درجات سے اس کی ذہن سازی نہیں کی۔ آپ دیکھیں گے کہ انگریزی ادب کے جو کلاسک داستان، کہانیاں اور ناول ہیں جنہیں کالج یا یونیورسٹی میں پڑھایا جاتا ہے، اس کے abridged ورژن، آسان اور عام فہم زبان میں نچلی جماعتوں میں بھی پڑھائی جاتی ہیں جس سے نہ صرف موضوعات مانوس لگتے ہیں بلکہ اوریجنل کلاسکس پڑھنے کی ذہن سازی بھی ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے یہاں الف لیلیٰ شاید واحد مثال ہو۔ کتب بینی کو فروغ دینے کے لیے ہمارے پورے نظامِ تعلیم کو ہی overhaul کرنے کی ضرورت ہے، بطورِ خاص اسکولوں میں۔

سوال: آپ کے ساتھ بات چیت کرنا بہت عمدہ رہا۔

میں اب شکریہ کے ساتھ بس آخری سوال کرنا چاہوں گا کہ آپ قارئین ادب کو کیا پیغام دینا چاہیں گے۔ جس کے ذریعہ ہم نئی نسل تک ادبی وراثت کو کچھ نہ کچھ منتقل کر سکیں۔ اور موج خیال جیسے آن لائن رسالوں کے حوالے سے آپ کیا کہیں گے؟

جواب: نئی نسل کے بیشتر گھروں میں ایک ہی حال ہے... ہمارے بچے انگریزی میڈیم سے پڑھ رہے ہیں، اور یہ خود سے تو اردو پڑھنے سے رہے۔ ان کے والدین یا سرپرست جو اردو داں طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، اپنے بچوں کو بیشک انگریزی میڈیم سے پڑھائیں کہ ترقی اور اچھی ملازمت ہر ایک کا بنیادی حق ہے مگر خدارا، اردو کو بطور ’’ نفل ‘‘ نہیں، کم از کم بحیثیت ’’ سنتِ مؤکدہ ‘‘ تو ضرور پڑھنے کی تاکید کریں۔ اس سے انہیں عربی سیکھنے میں بھی کافی مدد ملے گی اور اردو کا ادبی اثاثہ بھی ان کی دسترس سے بالکل باہر نہیں ہوگا۔ اور جو اردو میڈیم سے پڑھ رہے ہیں انہیں نصاب کے علاوہ اردو رسائل و جرائد کے ذریعہ بھی ادب سے جوڑے رکھنے کی کوشش کی جائے۔ گھر میں بطور خاص اردو میں ہی گفتگو کرنے کی شعوری کوشش کی جائے، اردو کتابوں کے مطالعے کا ماحول بنایا جائے۔ صرف محلّوں میں لائبریریاں کھول دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ گھروں کے اندر بھی اردو ادب کے موضوعات پر گفتگو/مباحثے کیے جائیں، نشستوں، مشاعروں اور ادب کی دیگر محفلوں میں نئی نسل کو شرکت کی ترغیب دی جائے۔ صرف اسکول کچھ نہیں کر سکتا کہ وہاں ادبِ عالیہ صرف ’’ نوٹس ‘‘ کی شکل میں رٹا جاتا ہے۔ المختصر، انفرادی گھروں میں ماحول ہی زیادہ اثرانداز ہوتا ہے۔ نئی نسل ہر چیز آن لائن ڈھونڈنے کی عادی ہوتی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ اردو زبان میں ریسرچ کرنے والے بھی اب لائبریریوں کی خاک نہیں چھانتے، بس آن لائن دستیاب مواد پر بہت زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ ایک معاملے میں، ہارڈ کاپی رسائل کے مقابلے ڈیجیٹل رسائل و جرائد نیز کتب کو بہت زیادہ advantage بھی حاصل ہے۔ مواد کی گھر بیٹھے آسانی سے دستیابی، سرچنگ، کاپی پیسٹ وغیرہ۔ ان سہولیات کے مدنظر، ڈیجیٹل رسائل بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہو جاتے ہیں۔ اگر آن لائن رسائل، عکسی یا پی ڈی ایف بیسڈ ہونے کی بجائے یونیکوڈ بیسڈ ہوں تب ہی سرچنگ اور کاپی پیسٹ کی سہولت سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ میں چاہوں گا کہ ’’ موجِ خیال ‘‘ بھی پی ڈی ایف سے یونیکوڈ کی طرف جلد ہی سفر کرے، اپنا ویب سائٹ بھی ہو تو پھر اس کی بین الاقوامی حیثیت بنتے دیر نہیں لگے گی بشرطیکہ کہ نئے شعراء و ادباء کو موقع دینے کے ساتھ ساتھ تحقیق کے لیے اہم مواد بھی مہیا کرنے کی جانب پیش رفت ہو۔

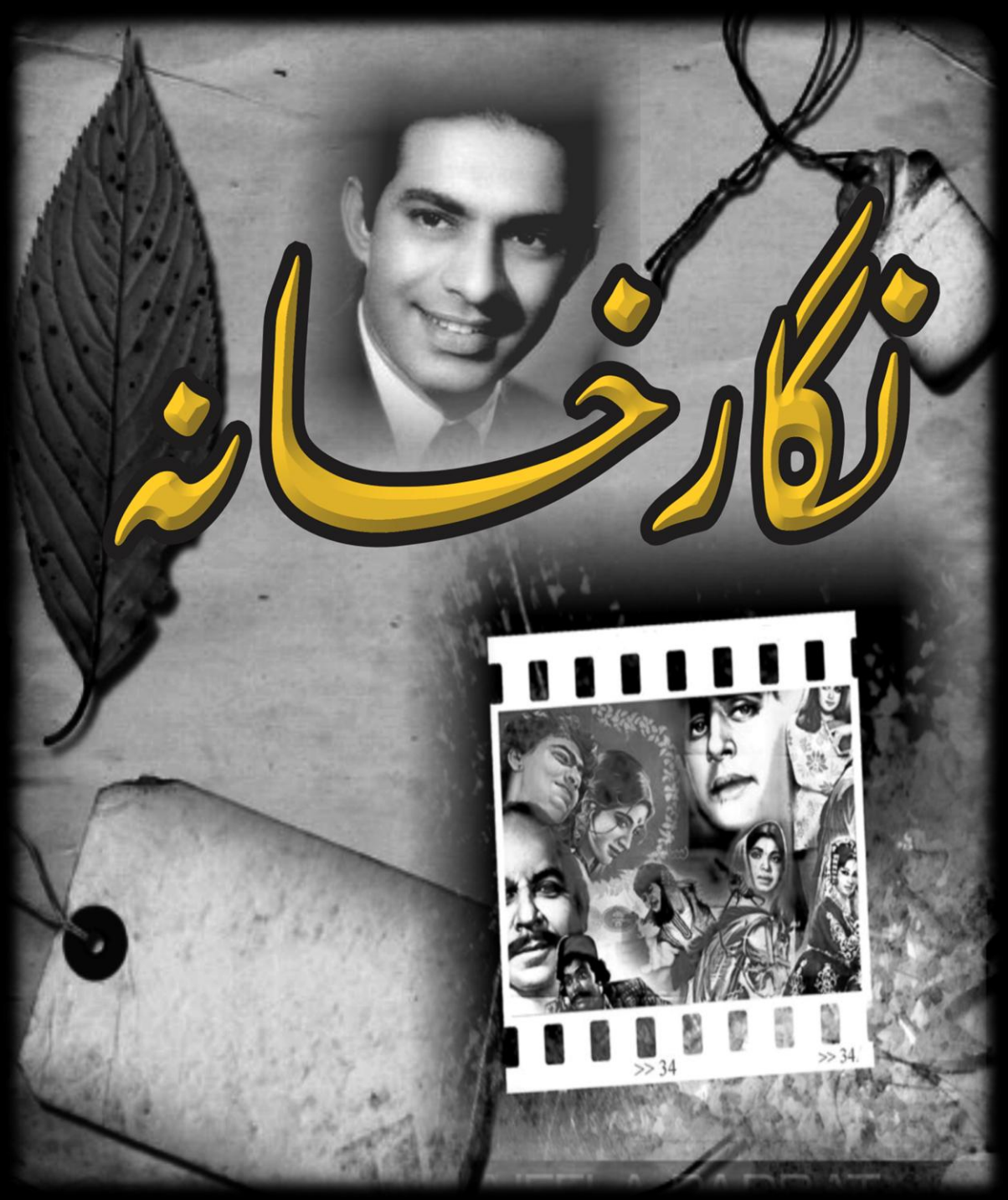
نگار خانہ

دل بہت اداس تھا اس شام۔

یہ اداسی کیوں تھی، یہ مجھے بھی نہیں معلوم تھا۔ ہوتا ہے ناں کہ کبھی کبھی دل یونہی دُکھی ہو جاتا ہے، بغیر کسی وجہ کے۔ جیسے کبھی خوشی بھی ہوتی ہے بس یونہی، بغیر کسی وجہ کے،

مجھے تو یہ درد، یہ اداسی مزہ دیتی ہے۔ پتہ نہیں میرا یہ اول جلول سا فلسفہ کسی کی سمجھ بھی آئے یا نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ درد کا اپنا ایک مزہ ہے اپنی خوبصورتی ہے۔ اندر کہیں جب گھنے بادل چھائے ہوں تو ہی بہترین فن تخلیق پاتا ہے۔ شاعر اپنی بہترین شاعری کرتا ہے، مصور حزن و ملال کے رنگوں سے زندگی سے قریب تر تصویر بناتا ہے، موسیقار بہترین، دل میں اتر جانے والی دُھنیں تخلیق کرتا ہے۔

اور نجانے کیسے میرے ہاتھ خود بخود کار کے میوزک پلئیر پر چلے گئے اور ایک آواز میرے کانوں میں رس گھولنے لگی

"شام غم کی قسم آج غمگیں ہیں ہم
آ بھی جا آ بھی جا آج میرے صنم
شام غم کی قسم

درد کو جب درد کا ساتھ مل جائے تو شاید درد کا درماں ہونے لگتا ہے۔ یوں لگا جیسے میری اداسی کو زباں مل گئی ہو۔

اور اس شام ہی نہیں، جب بھی طلعت محمود کو سنا یوں لگا جیسے دل کے زخموں پر کوئی پھولوں سے تھپکی دے رہا ہے۔ طلعت کی ملکوتی، دل کو چھوتی، ریشم سی ملائم، کانپتی درد بھری اور کانوں میں شہد گھولتی آواز جب بھی سنی دل کو یوں سکون ملا ہے کہ روح تک سرشار ہو گئی۔

اردو گائیکی اور خصوصاً غزل گائیکی میں طلعت کا انداز سب سے منفرد ہے۔ دوسرے گلوکار بھی اپنی جگہ ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور ہر ایک کا اپنا مقام ہے اور کچھ تو طلعت محمود سے کہیں بڑھ کر بھی ہیں لیکن مجھے جو سکون طلعت کی آواز میں ملتا ہے وہ کچھ میرا دل ہی جانتا ہے۔

وہ آواز جسے کانپتی ہوئی آواز کہہ کر رد کر دیا گیا، وہی کانپنا اس آواز کی خوبی بن گیا۔ طلعت کا سریلا پن، آواز کی مٹھاس، لہجے کا درد اور پھر یہ سب جب خوبصورت ترین کلام سے مل جاتے ہیں تو جو چیز تخلیق پاتی ہے اسے وہی سراہ سکتے ہیں جو اس آواز کے دیوانے ہیں اور یہ دیوانے آج بھی کم نہیں۔

شاعروں اور اہل علم کے شہر لکھنؤ میں پیدا ہونے والے طلعت محمود کے والد بھی گاتے تھے لیکن عارفانہ کلام یعنی حمد و نعت کے علاوہ کچھ اور گانے کے سخت خلاف تھے اور جب انہوں نے طلعت کا گانے کا شوق دیکھا تو صاف کہہ دیا کہ گانا بند کرو یا میرے گھر سے نکل جاؤ۔ طلعت ایک فرمانبردار بیٹے ثابت ہوئے، یعنی گھر سے نکل گئے۔

طلعت گھر سے نکلے اور ریڈیو اسٹیشن پہنچ گئے جہاں سولہ سال کی عمر میں انہوں نے آل انڈیا ریڈیو پر پہلا گانا ریکارڈ کروایا۔ دو سال نہیں گذرے تھے کہ ایچ ایم وی ریکارڈنگ کمپنی نے ان سے معاہدہ کر لیا اور پہلا ریکارڈ ان کا گیت '' سب دن ایک سمان نہیں '' منظر عام پر آیا۔

ہمارے بہت پیارے دوست معراج جامی صاحب کے برادر بزرگ فیاض ہاشمی فلمی شاعری کا بہت بڑا نام ہیں۔ فیاض ہاشمی ہی کا گیت '' تصویر تیری دل میرا بہلا نہ سکے گی '' طلعت کو شہرت کی ان بلندیوں پر لے گئی جہاں سے انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ یہ 1944 کی بات ہے۔ اس وقت اس گیت کی لاکھوں کاپیاں فروخت ہوئیں۔ طلعت کی اگلی منزل کلکتہ تھی جہاں انہوں نے تپن کمار کے نام سے اپنی آواز کا جادو جگایا۔ اور شاید یہیں انہیں مشہور موسیقار انل بسواس مل گئے جو انہیں بمبئی لے آئے اور ان سے فلم '' آرزو '' میں '' اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل جہاں کوئی نہ ہو '' گوایا۔ مجروح سلطان پوری کے اثر انگیز بول، انل بسواس کی دلآویز موسیقی، طلعت کی دل میں اترتی آواز اور دلیپ کمار کی حزن و ملال سے پر اداکاری۔ یہ ابتداء تھی ایسے کئی اور دل کو چھو لینے والے نغموں کی جو طلعت کے پر سوز گلے سے نکلنے والے تھے۔

طلعت کی شخصیت بھی ان کی آواز کی طرح سلجھی ہوئی، صاف ستھری اور باوقار تھی۔ اور جب یہ خوبصورت آواز اور شخصیت یکجا ہوں تو بھلا بالی ووڈ کی فلمی دنیا انہیں کیسے نظر انداز کر دیتی اور جب دونوں طرف آگ برابر لگی ہو یعنی طلعت کو بھی اداکاری کا شوق ہو تو پھر انہیں فلموں میں آنے سے کون روک سکتا تھا چنانچہ کئی فلموں میں اداکاری کی اور ہیرو بھی بنے۔

بطور اداکار راج لکشمی، تم اور میں، آرام، دلِ نادان، ڈاک بابو، وارث، رفتار، دیوالی کی رات، ایک گاؤں کی کہانی، لالہ رخ، سونے کی چڑیا اور مالک نامی فلموں میں اداکاری کے جوہر بھی دکھائے اور کانن بالا، کانن دیوی، بھارتی دیوی سے لے کر ثریا، مدھو بالا، شیاما، مالا سنہا، نادرہ اور نوتن وغیرہ تک کے ساتھ ہیرو آئے۔ لیکن فلموں میں طلعت زیادہ مقبول نہیں ہوئے چنانچہ پھر انہوں نے ساری توجہ گانے پر ہی رکھی اور یہ ان کا اپنے پرستاروں پر بڑا احسان تھا۔

طلعت کے زمانے میں محمد رفیع، مکیش، کشور، ہیمنت کمار، مناڈے وغیرہ کی دھوم تھی اور یہ سارے نام ایک سے بڑھ کر ایک ہیں، ایسے میں اپنے لیے ایک الگ جگہ بنانا طلعت محمود کا ہی کمال تھا۔

غزل طلعت کا خاص میدان ہے۔ انہیں شہنشاہ غزل بھی کہتے ہیں گو کہ مہدی حسن نے غزل کو ایک الگ ہی مقام دیا اور صحیح معنوں میں وہی شہنشاہ سوز اور شہنشاہ غزل کہلاتے ہیں۔ لیکن طلعت کا اپنا ایک انداز ہے جو ان کے چاہنے والوں کے جی کو بھاتا ہے۔ غزل کے علاوہ، گیت، اور نظمیں وغیرہ بھی گائیں۔ وہ محمد رفیع کی طرح ورسٹائل یا کشور کی طرح شوخ نہیں تھے اور ان کا انداز بہت محدود اور مخصوص تھا لیکن ان کے پرستار انہیں اسی وجہ سے چاہتے ہیں اور جو درد اور گھمبیرتا طلعت کی آواز میں ہے اسی کے دیوانے ہیں۔

مجھے نہیں پتہ کہ طلعت نے کتنے گیت گائے لیکن میں تو ان کا جو بھی گانا سنتا ہوں بس سنتا ہی رہ جاتا ہوں۔ اور طلعت کے گیت میں گھنٹوں سن سکتا ہوں۔ یہ واحد گلوکار ہیں جنہیں میں کسی بھی وقت سن سکتا ہوں اور کبھی بھی سن کر اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔

یوں تو طلعت کے گانے سنیل دت، بھارت بھوشن، دیو آنند، راج کپور وغیرہ بھی فلمائے گئے ہیں لیکن دلیپ کمار پر فلمائے گئے ان کے گیتوں کی بات ہی الگ ہے۔ ٹریجیڈی کنگ اور شہنشاہ سوز کے ملاپ نے ہندی سنیما کے خوبصورت ترین حزنیہ گیت جنم دیے ہیں۔

اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل کے علاوہ۔اے میرے دل کہیں اور چل،،،شام غم کی قسم، سینے میں سلگتے ہی ارمان،،،یہ ہوا یہ رات یہ چاندنی، ۔۔ہم درد کے ماروں کا،،، ملتے ہی آنکھیں دل ہوا۔۔یہ سارے گیت دلیپ کمار پر فلمائے گئے۔اس کے علاوہ سنیل دت پر فلمایا ہوا '' جلتے ہیں جن کے لیے تیری آنکھوں کے دیئے ''اور '' اتنا نا مجھ سے تو پیار بڑھا ''اور ایسے کئی گیت ہیں جو جب بھی سنے جائیں کانوں میں رس گھولتے ہیں۔

طلعت محمود نہ تو محمد رفیع ہیں، نہ مہدی حسن جیسا گا سکتے ہیں، نہ کشور کمار یا مکیش یا مناڈے ہیں۔ان کا کمال یہ ہے کہ وہ طلعت محمود ہیں اور ان جیسا کوئی نہیں۔

نوشاد کو طلعت کی آواز بہت پسند تھی لیکن وہ طلعت محمود کی سگریٹ نوشی سے بہت نالاں رہتے تھے اور آخر چڑ کر انہوں نے طلعت سے گوانا بند کر دیا۔یہی سگریٹ نوشی جس نے طلعت کے گلے میں سوزش پیدا کیا تھا گلے کی سوزش کا سبب بن گئی اور اسی نے ہم سے ایک بہت ہی سریلا، میٹھا، درد بھری ریشمی آواز والا گلوکار چھین لیا۔

میرے نوجوان دوست حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں آج یہ کس کا ذکر لے بیٹھا۔انہیں شاید میری بات سمجھ نہ آئے۔تو ان کو میرا مشورہ ہے کہ کبھی ذرا تنہائی میں بیٹھ کر یہ چند ایک گیت سنیں اور مجھے بتائیں کہ ان کے دل کا کیا حال ہے۔

بے چین نظر بے تاب جگر یہ دل ہے اسی کا دیوانہ

ہم درد کے ماروں کا اتنا سا ہے افسانہ

زلفوں کی سنہری چھاؤں تلے

سب کچھ لٹا کے ہوش میں آئے تو کیا کیا

میرا قرار لے جا مجھے بے قرار کر جا

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے

میں دل ہوں اک ارمان بھرا

تصویر بناتا ہوں تصویر نہیں بنتی

جائیں تو جائیں کہاں

زندگی دینے والے سن

ہم سے آیا نہ گیا تم سے بلایا نہ گیا ابھی اور بہت سے گیت ہیں۔آپ یہ سن لیں تو پھر خود ہی مزید کی تلاش میں نکل جائیں گے۔آزمائش شرط ہے۔

افسانہ فکشن کی ایک قسم یا ایسی کہانی جو ایک نشست میں پڑھی جا سکتی ہے۔۔

اور فکشن ہر وہ تحریر ہے جس میں مصنف اپنے تخیل کی دنیا اور کرداروں کے زریعہ اپنے خیالات قاری تک پہنچاتا ہے اور تفریح فراہم کرتا ہے۔

غیر معمولی واقعات، انسان کی عقل و خرد سے ماورا، انسان کی سوچ سے بلند تمام محیر العقل چیزیں فکشن کہلاتی ہیں۔

اس کو ہم حقیقت کا متضاد بھی کہہ سکتے ہیں۔

اسکالرز کے مطابق فکشن وہ ہے جس کی کوئی سند نہ ہو اور حقیقت سے پرے ہو۔ فکشن لفظ فرانسیسی، قدیم انگریزی اور لاطینی زبان کے مختلف الفاظ کا مجموعہ ہے جس کے معنی ایجاد کرنا، جھوٹی کہانی یا کوئی بات گھڑنا ہوتا ہے۔

جیمس وڈ کہتے فکشن قابل یقین جھوٹ ہوتا ہے۔ پروفیسر لارس بو ہے مور ٹیسین کہتے ہیں فکشن وہ ہے جس میں پڑھنے اور لکھنے والے کے بیچ ایک ان کہا معاہدہ ہوتا ہے کہ حقیقت نہیں ہے۔

داستان گوئی انسانی تاریخ میں زمانہ قدیم سے موجود رہی ہے خاص کر مصر اور ایشیاء میں۔ لیکن یورپ میں فکش کی شروعات یونانی شاعر ہومر، ہیسوئیڈ اور ایسوپ (لقمان) سے ہوئی۔ اس دور میں فکشن میں تاریخ اور ماورائی کہانیوں کا رنگ پایا جاتا تھا۔ یونان اور روم میں لکھی گئی مائلیسین کہانیاں فکشن کی پہلی مثال سمجھی جاتی ہیں۔ گذرتے وقت کے ساتھ ان میں رومان مذہب، تہذیب اور کلچر کے رنگ نمایاں ہونے لگے۔ عہد وسطی میں جہاں بائبل میں فکشن کی آمیزش ہوئی وہیں تاریخ میں بھی فکشن کی آمیزش ہونے لگی اس کی ایک بڑی مثال سکندر اعظم کے بارے میں لکھی کہانیاں ہیں۔

ہندوستان میں سنسکرت لٹریچر کی ابتدا 1200 قبل مسیح میں ہوئی لیکن مہابھارت اور رامائن جیسی رزمیہ داستانیں دو سو قبل مسیح میں وجود میں آئیں ۔ تقریباً اسی دوران تامل لٹریچر کی شروعات بھی ہوئی۔ سنسکرت میں ڈرامہ نگاری کی شروعات کالی داس نے چوتھی صدی عیسوی میں چندر گپت

موریادوم کے دور میں کی۔ان کے لکھے مشہور ڈرامہ شکنتلااور میگھ دوت آج بھی پڑھے جاتے ہیں۔۔ سنسکرت اور تمل کے علاوہ بنگلہ، گجراتی مراٹھی کنڑاز بانوں میں باقاعدہ لکھنے کی شروعات دسویں بارہویں صدی کے آس پاس ہوئی۔

بارہویں صدی میں ہی یورپ میں فکشن کی پہلی باقاعدہ کتاب لکھی گئی جو کنگ آرتھر کی کہانیاں تھیں۔۔لیکن اب بھی فکشن اور حقیت کی درجہ بندی ہونے اور ناول کے وجود میں آنے کو صدیاں باقی تھیں۔۔

اردو زبان کی ابتداء بھی بارہویں صدی میں ہوئی اور اردو ادب کی بنیاد چودہویں صدی میں دکن میں پڑی۔پندرہویں صدی سے انیسویں صدی تک کا دور اردو میں شاعری کا ارتقائی دور کہا جاسکتا ہے۔دکن میں قلی قطب شاہ اور ولی دکنی سے ہوئی شروعات لکھنؤ میں میر، درد سے دہلی میں مومن، ذوق اور غالب تک پہنچی۔اردو میں جدید نثر کی ابتدا غالب کے خطوط مانے جاتے ہیں۔اس کے بعد شبلی نعمانی، حالی اور سر سید احمد خان نے نثر کی روایت کو آگے بڑھایا۔۔اردو میں فکشن اور ناول کی باقاعدہ ابتداء انیسویں صدی میں ہوئی۔۔

فکشن کی ہر قسم میں کچھ چیزیں اہم ہوتی ہیں پلاٹ، کردار، تھیم، پس منظر، تنازعہ اور بیانیہ۔۔واقعات کا تسلسل پلاٹ کہلاتا ہے۔۔ کس دور میں کس جگہ کہانی واقع ہوئی ہے یہ پس منظر یا سیٹنگ طے کرتا ہے اور کہانی میں دیا گیا میسج اس کی تھیم کا تعین کرتا ہے۔ فکشن میں داستان، فیری ٹیلز، ڈرامہ، ناول، افسانہ سب ہی کچھ شامل ہے جس سے قاری کو تفریح فراہم کی جائے۔ لیکن عمومی طور پر لوگ فکشن کو ناول، افسانہ یا شارٹ اسٹوری سے منسوب کرتے ہیں۔

افسانہ نگاری کی تاریخ

انسانی تہذیب میں قصہ گوئی ہمیشہ سے موجود رہی ہے لیکن گذرتے وقت کے ساتھ اس نے ایک مخصوص شکل اختیار کی جسے ناول کہا گیا۔انسانی زندگی کی بھاگ دوڑ اور وقت کی کمی نے ناول کو مزید مختصر کر کے افسانہ کو جنم دیا۔ کچھ محققین افسانہ کو ناول کی مختصر شکل نہ مان کر ایک نئی صنف قرار دیتے ہیں۔

افسانہ کے عناصر میں بھی قصہ، پلاٹ اور کردار مرکزی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں لیکن ناول کے برخلاف افسانہ ایک ایسی نثر ہوتی ہے جس میں پوری زندگی کی کہانی بیان کرنے کی جگہ زندگی یا کردار کا صرف ایک رخ بیان کیا جاتا ہے اور یہ اختصار اس کے اسلوب کی اہمیت بڑھا دیتا ہے۔افسانہ میں ایک ایک لفظ کی اہمیت ہوتی ہے اور اس کے لئے رائٹر کا زبان و بیان پر قدرت ہونا بہت اہم ہوتا ہے۔

ایڈگر ایلن پو افسانہ کی تعریف میں کہتا ہے کہ افسانہ وہ کہانی ہے جسے ایک نشست میں پڑھ لیا جائے۔

یہ کہ سکتے ہیں کہ افسانہ مختصر الفاظ میں حقیقت پسندی اور محدود کرداروں کے ساتھ زندگی کے کسی خاص پہلو کو اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ وہ مکمل محسوس ہو۔افسانہ کا مقصد کوئی خاص سبق، کوئی خاص لمحہ اور کیفیت کو بیان کرنا ہوتا ہے اور خیال کی یہ وحدت افسانہ کا اہم جزو ہے اس کے بغیر افسانہ معیاری نہیں ہو سکتا۔اس کے علاوہ افسانہ میں رمزیت کا موجود ہونا اور اس رمزیت اور تجسس کو قائم رکھنا ہی افسانہ نگار کی خوبی ہوتی ہے۔۔

مختصر کہانی کی شروعات دو ہزار قبل مسیح میں مصر سے ہوئی۔ سو قبل مسیح میں لکھی انڈیا کی مشہور پنچ تنترا کی کہانیاں بھی اسی صنف میں آتی ہیں۔ عہد وسطی آتے آتے عربی میں لکھی الف لیلی کی کہانیاں اور چاسر کی کینٹر بری ٹیلز جیسی سدا بہار کہانیاں لکھی جانے لگیں۔ لیکن سترہویں اٹھارہویں صدی میں ناول کی آمد نے مختصر کہانیوں کو پس پشت ڈال دیا۔

انیسویں صدی میں مختصر کہانی نے پھر زور پکڑا ایڈگر پو سے لے کر نکولا گوگول تک کئی بڑے ناموں نے مختصر کہانیاں لکھیں۔۔ نیتھنیل ہوتھرون کی لکھی Twice told tales موجودہ مختصر کہانی کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔روس میں چیخوف، میکسم گورکی، فرانس میں موپاساں اور فلابیر، انگلستان میں کیتھرین مینسفیلڈ نے اس فن کو عروج تک پہنچایا۔

اردو میں فکشن کی ابتداءاور ارتقاء

اردو زبان کی تاریخ محض نو سو سال پرانی ہے اور اردو نثر کی فقط تاریخ سات سو سال۔اردو کے ابتدائی دور میں اس کی فروغ میں بڑا ہاتھ صوفیاء کرام کا رہا۔خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی لکھی" معراج العاشقین "اردو یا دکنی کی اولین کتابوں میں سے ہے۔اردو نثر کا اگلا سنگ میل سترھویں صدی میں دکن میں رکھا گیا جب وجہی نے 1665 میں اپنی تمثیلی کتاب " سب رس "لکھی۔اس کے بعد آنے والی اکثر کتابیں فارسی اور سنسکرت کے تراجم اور مذہب و تصوف سے متعلق تھیں۔اٹھارہویں صدی میں سید حسین عطا کی" نوطرز مرصع "آئی جو اردو نثر میں اہمیت رکھتی ہے یہ قصہ چہار درویش کا ترجمہ تھی۔1800 میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد پڑی جس نے اردو نثر کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔۔میر امن کی" باغ و بہار "اور نہال چند کی" گل بکاولی " یہیں لکھی گئیں۔ان اہم کتابوں کے علاوہ اس دور کے نثری سرمایہ کا گراں قدر حصہ غالب کے خطوط تھے جس نے جدید نثر کی ابتدا کی۔

اس دور میں حالی، سر سید، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد جیسے لوگوں نے اپنے قلم سے اردو کو جگمگایا اسے نکھارا اور نیا رنگ روپ دیا اور اردو فکشن کا ایک نیا باب شروع ہوا۔۔ناول ڈرامہ نگاری اور افسانہ سب ہی اردو کے گلستاں کو مہکاتے گئے۔

اردو میں افسانہ نگاری

اردو میں افسانہ نگاری کی ابتدا بیسویں صدی کی ابتدا میں میں ہوئی۔اور یہ صنف مغرب سے متاثر ہو کر اردو میں آئی ہے لیکن سو سالوں میں اردو افسانہ نے انفرادیت اور گہرائی کے جس معیار کو چھوا ہے وہ اسے کسی اور زبان کے افسانوی ادب کے مقابلے میں قابل فخر ثابت کرتا ہے۔۔

اردو میں لکھا گیا پہلا افسانہ کس کا ہے اس پر مختلف آرا رہی ہیں۔کچھ سجاد یلدرم کے " نشے کی ترنگ "کو پہلا افسانہ کہتے کچھ روایت کے مطابق پریم چند کا" انمول رتن "پہلا افسانہ ہے پروفیسر حامد بیگ کی تحقیق کے مطابق راشد الخیری کا 1903 میں لکھا افسانہ " نصیر اور خدیجہ " اردو کا پہلا افسانہ تھا۔زیادہ اور معتبر آرا آج اس کے ساتھ ہیں اس وجہ سے اب اس کو ہی اردو کا پہلا افسانہ شمار کیا جاتا ہے۔

لیکن اس بات سے قطع نظر کہ پہلا افسانہ کس کا ہے اردو افسانہ کی بنیاد رکھنے اور آبیاری کرنے میں اہم ترین کردار پریم چند کا ہے اس پر سب ہی کا اتفاق ہے۔

پریم چند کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع ہے۔جہاں پہلے مجموعے سوز وطن میں حب الوطنی اور داستان کے رنگ نظر آتے ہیں وہیں پریم پچیسی بتیسی کے افسانہ ہندو راجپوتوں کی عظمت رفتہ کا بیان کرتے ہیں تو آخری مجموعہ میں بڑے گھر کی بیٹی جیسے افسانوں میں ہندوستان کے متوسط اور دیہی گھرانوں کے سیاسی اور سماجی مسائل کو اجاگر کیا۔ان سب میں ایک مشترکہ چیز حقیقت نگاری اور ہندوستانی عوام ہے۔پریم چند کے ہم عصروں میں سجاد یلدرم، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری نظر آتے ہیں جنہوں نے افسانوں کے لئے رومانوی اور بے باک انداز کو منتخب کیا۔ان کے علاوہ محمد مجیب اور منصور احمد جیسے کئی مترجمین بھی افسانوی ادب کے پہلے پچیس سالوں میں نظر آتے ہیں گو یہ مترجم افسانہ ادبی معیار سے اعلی نہیں کہلائے جا سکتے لیکن ان تراجم نے اردو افسانہ نگاروں کو افسانہ نگاری کے بنیادی لوازمات سے آگاہی دی۔

منشی پریم چند کا بیک گراؤنڈ

دھنپت رائے شری واستو کا جنم 31 جولائی 1880 میں بنارس کے قریب ایک گاوں میں کائستھ فیملی میں ہوا۔ان کی والد عجائب لال پوسٹ آفس میں کلرک تھے اور والدہ آنندی دیوی زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔۔پریم چند پندرہ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے اور بڑی معاشی تنگ دستی اور محنت و مشقت سے اپنے ابتدائی دن گذارے۔لال پور وارانسی کے مدرسہ میں اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور اٹھارہ سال کی عمر میں

مشکل سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر مختلف ملازمتیں اختیار کیں اور تقریباً چالیس سال کی عمر میں 1919 میں انگریزی اور فارسی میں بی اے مکمل کیا اور ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول بنے۔ 1929 میں انھوں نے ہندی اردو رسالہ ہنس نکالا۔ 1934 میں ممبئی آکر فلم مزدور کی کہانی بھی لکھی۔ بنارس میں سرسوتی پریس بھی لگایا تھا جو چل نہیں سکا۔ 1936 میں انھیں انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ ایک پُر مشقت اور کسمپرسی کی زندگی گزار کر 8 اکتوبر 1936 کو وہ دنیا سے کوچ کر گئے لیکن اپنا نام اردو ادب کی تاریخ میں سنہرے حروف میں درج کروا گئے۔

پریم چند نے ہندی اردو دونوں زبانوں میں اپنا لوہا منوایا۔ وہ اردو کے افسانوی ادب کے بانی کہلاتے ہیں اور ہندی ساہتیہ میں انھیں اپنیاس سمراٹ کہا جاتا ہے۔

پریم چند کو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا اسی لئے انھوں نے بہت کم عمری سے نواب رائے کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن ان کی ابتدائی تحاریر دستیاب نہیں ہیں ان کا پہلا ناول صرف تیئس سال کی عمر میں اسرار معابد 1903 میں بنارس کے ہفت روزہ اخبار میں شائع ہوا۔

افسانہ نگاری کی شروعات 1907 میں کی جب سوزِ وطن نامی افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا جو حب الوطنی پر لکھی کہانیاں تھیں اسے نہ صرف حکومت نے بین کر دیا بلکہ اس کی کاپیاں تک جلا دیں۔ اس کے بعد انھوں نے نواب رائے کا قلمی نام ترک کر کے پریم چند منتخب کیا اور دو تین مختصر ناول اور لکھے لیکن اردو میں پبلشر زملنا کافی مشکل تھا اس لئے 1914 میں پریم چند نے ہندی میں لکھنا شروع کیا ان کی پہلی کہانی دسمبر 1915 میں شائع ہوئی۔

ان کا اگلا مشہور ہندی ناول 1919 میں شائع ہونے والا سیوا سدن تھا جو اردو میں بازارِ حسن کے نام سے شائع ہوا۔ 1921 میں گاندھی جی کی سول نافرمانی کی تحریک کے باعث پریم چند نے سرکاری نوکری چھوڑ دی اور اپنی ساری توجہ اپنی تحریری کاموں پر مرکوز کر دی۔ 1923 میں پریم چند نے سرسوتی پریس نام سے پرنٹنگ پریس قائم کیا 1924 میں ان کا ناول رنگ بھومی آیا۔

لیکن پریم چند کے فن کا کمال 1925 میں آنے والے ناول نرملا سے واضح ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے پرتگیا اور غبن اور میدان عمل لکھے اور ان کا آخری شاہکار ناول گودان 1936 میں آیا۔

ان ناولوں کے علاوہ ان کے سیکڑوں افسانوں کے گیارہ مجموعہ شائع ہوئے ہیں جن میں پریم پچیسی، پریم بتیسی، پریم چالیسی، خاک پروانہ، فردوسِ خیال، خواب وخیال، آخری تحفہ، زادراہ، دودھ کی قیمت اور وارادت ہیں۔

پریم چند کی انفرادیت

اردو افسانہ نگاری میں پریم چند بہت بڑے اور عہد ساز افسانہ نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے اردو افسانے میں حقیقت نگاری اور مقصدی ادب کی بنیاد رکھی سامراجی قوتوں کے خلاف آواز اٹھانے کے علاوہ، کرپشن، بال ودھوا، جاگیر دارنہ نظام، غریبی اور عورتوں کا استحصال ہر موضوع پر لکھا۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے سے لے کر آخر میں لکھے افسانوں میں بتدریج تبدیلی نظر آتی ہے موضوع کی تبدیلی کے ساتھ فنی عروج بھی نظر آتا ہے اس لئے اکثر محققین ان کے فن کو مختلف ادوار کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔

کچھ اسے تین ادوار میں بتاتے ہیں جبکہ

مشہور محقق اور ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین پریم چند کی تحریر نگاری کو چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں جس میں پہلا دور 1903 سے 1909 ان کی ابتدائی کوششوں کا دور تھا جب وہ ادبی دنیا میں اپنے قدم جما رہے تھے۔ ان کے فن کے اصل رنگ بقیہ تین ادوار میں نظر آتے ہیں

1909 سے 1920 تاریخی اور داستانوی رنگ کے افسانہ: پہلے افسانوی مجموعے سوز وطن پر انگریز حکومت کے رد عمل کے بعد پریم چند تاریخ اور اصلاح معاشرے کی طرف مائل ہوئے اور کسی حد تک حالی کے انداز میں انہوں تاریخی حوالوں سے قوم میں شعور جگانے کی کوشش کی۔ اس دور کے ان کے افسانہ رانی سارندھا اور راجہ ہردول میں افسانہ کی حقیقت پسندی کی جگہ داستانوی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

1920 سے 1932 کا یہ دور اصلاحی اور سیاسی افسانوں کا تھا اس دور میں انھوں نے اپنے معاشرے میں موجود ہر قسم کی برائیوں پر قلم اٹھایا، غریبوں پر ظلم، ذات پات کا امتیاز، سرمایہ دارانہ نظام میں پسنے والے غریب مزدور اور کسان کی کسمپرسی کی اپنے افسانوں میں بڑی عمدہ عکاسی کی اور لوگوں میں ان برائیوں کے خلاف اٹھنے کا شعور جگانے کی کوشش کی۔ وہ ٹالسٹائی اور مہاتما گاندھی کے افکار سے متاثر تھے اور اہنسا اور سدھار کے ذریعہ معاشرے میں بہتری کے خواہش مند تھے۔۔

1932 سے 1936 سیاسی اور فکری دور۔۔ اس میں انھوں نے انسانی نفسیات اور دیگر معاشرتی مسائل پر لکھا۔ یہ دور ان کے فن کا عروج کہا جاسکتا ہے۔ سوز وطن، حج اکبر، عید گاہ، منتر سے " کفن "تک ان کا فنی اور فکری سفر مسلسل بلندی کی جانب سفر کرتا نظر آتا ہے۔ افسانہ کفن انسانی رویوں پر غربت کے اثرات کو بڑے ہی دل گداز انداز میں بیان کرتا ہے۔

پریم چند کا اسلوب سادہ ہے وہ اپنے افسانوں میں فارسی یا سنسکرت کی آمیزش نہیں کرتے ان کے مکالمہ کردار کے پس منظر افسانہ کے ماحول کے مطابق ہوا کرتے ہیں۔

ان کے افسانوں میں رومان اور انقلاب کے ملے جلے خوب صورت رنگوں میں آمیزش ہے۔ اعلی کردار نگاری ہے اور ایسے کردار ہیں جو حقیقت کے عکاس ہیں، مظلوم ہیں، جدوجہد کرنے والے ہیں انسان دوست ہیں۔ نفسیاتی تجزیہ ان کی کرداری نگاری کا بہت بڑا حربہ تھا۔ ان کے افسانہ دیہاتی اور ہندوستانی پس منظر کے ہونے کے باوجود اپنی حقیقت نگاری کے باعث آفاقی کشش رکھتے ہیں۔۔ یہ کہ سکتے ہیں کہ پریم چند کے افسانوں میں حقیقت کی تلخیوں کے ساتھ اصلاح کی کوشش اور امید کی روشنی بھی نظر آتی ہے۔۔

بارہ سے زائد ناول اور تین سو افسانوں ڈرامہ اور آرٹیکل لکھنے والے منشی پریم چند اردو فکشن کا اہم ستون اور اردو افسانوی ادب کے بانیوں میں ایک اہم ترین نام ہیں۔

جس دور میں پریم چند نے لکھا وہ دور ہندوستان اور عالمی سطح پر سماجی اور سیاسی تحریکوں کا تھا جس نے ساری دنیا کے ادب پر اپنا اثر ڈالا۔ سوشلزم کا تصور ہندوستان پہنچا اور ترقی پسند تحریک کی شروعات ہوئی اور لکھنے والوں کی ایک نئی نسل سامنے آئی جو ایک طرف سماج میں ہونے والے استحصال، افلاس غربت اور سیاسی موضوعات پر نشتر لگاتی ہے تو دوسری طرف جنسی اور نفسیاتی موضوعات سے بھی بھرپور انصاف کرتی ہے۔ 1936 سے تقسیم تک اردو افسانہ نگاری میں اسی نسل نے پریم چند کی لگائی فصل کی بھرپور آبیاری کی۔ ان افسانہ نگاروں کی فکر، موضوع اسلوب غرض افسانہ کے ہر پہلو کو بلندی پر پہنچادیا۔ ان میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری اور سجاد ظہیر جیسے نام شامل ہیں۔

ان صف اول کے افسانہ نگاروں کے ساتھ ہی ابھرتی ہوئی اگلی نسل بھی ایسے ناموں سے درخشاں ہے جنہوں نے اردو افسانہ کو دوام بخشا۔ قرۃ العین حیدر، اشفاق احمد، شوکت صدیقی، ہاجرہ مستور، خدیجہ مسرور، بلونت سنگھ، انتظار حسین، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی ، اے حمید، واجدہ تبسم نے افسانہ نگاری کے فن کو آگے بڑھایا۔ گو پچھلی نسل کی طرح موضوع غیر ملکی جبر اور سیاسی جدوجہد سے ہٹ کر ہجرت کے مسائل فسادات اور دیگر معاشی مسائل بنتے گئے ۔ان لکھنے والوں میں انتظار حسین نے " آخری موم بتی " جیسے افسانہ لکھ کر کردار نگاری میں اپنی مہارت ثابت کی تو اشفاق احمد رشتوں کی باریکیوں سے روشناس کرواتے ہیں اور قاضی عبدالستار اپنے منفرد انداز میں جاگیر دارانہ نظام کے زوال کا قصہ سناتے ہیں۔ 1980

کے بعد کا دور افسانہ میں بہت سی تبدیلیاں لایا ۔افسانہ محض تفریح طبع کا ذریعہ نہ ہو کر زندگی اور معاشرے کے مسائل کو گہرائی سے دیکھنے کا ذریعہ بن چکا ہے۔اردو افسانہ نگار اب ملکی حدود سے نکل کر عالمی سطح پر دیکھتا اور لکھتا ہے۔دہشت گردی، فرقہ واریت، عورتوں کا استحصال، غیر ملکی سیاست، اخلاقی قدروں کی پامالی، سوشل میڈیا کے اثرات جیسے بے حساب موضوعات ہیں جن پر دور حاضر کے افسانہ نگار قلم اٹھا رہے ہیں۔۔

انور سجاد، سریندر پرکاش، نورالحسنین، رشید امجد، صلاح الدین پرویز، ترنم ریاض، عبید قمر، نیلوفر اقبال، عرفان احمد، کریم مصطفی، ڈاکٹر رشید امجد ،زاہدہ حنا، مسعود مفتی، احسان مجید جیسے ناموں کی ایک طویل فہرست ہے جو اکیسویں صدی میں اردو افسانہ کو اکیسویں صدی کے مسائل اور تبدیلیوں سے ہم آہنگ کر رہے ہیں۔۔

اردو افسانہ اپنے سو سالہ سفر میں ارتقاء کی منزلیں طے کر چکا ہے موضوع، تکنیک، اسلوب، حقیقت نگاری اور فنی مہارت سب میں آج مغربی افسانہ کے قریب تر ہے۔افسانچہ، مائیکرو فکشن اور سو لفظی کہانی کی آمد سے افسانہ کے بارے تشویش پائی جاتی ہے لیکن جس سفر کی ابتدا پریم چند نے کی تھی افسانہ کا وہ کارواں آج بھی رواں دواں ہے۔۔

شام کا وقت تھا۔ ڈاکٹر چڈھا گولف کھیلنے جا رہے تھے۔ موٹر دروازے کے سامنے کھڑی تھی کہ دو کہار ڈولی لیے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ڈولی کے پیچھے ایک بوڑھا نحیف آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ڈولی مطب کے سامنے آکر رک گئی۔ بوڑھے نے دھیرے دھیرے دروازہ پر آکر اندر جھانکا۔ ایسی صاف ستھری زمین پر اسے پیر رکھتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چلانہ دوڑے۔

ڈاکٹر صاحب نے چق کے اندر سے گرج کر کہا۔ ''کون ہے، کیا چاہتا ہے؟''

بوڑھے نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ہجور بڑا گریب آدمی ہوں، میرا لڑکا کئی دن سے.

ڈاکٹر نے سگار جلاتے ہوئے کہا۔ ''کل سویرے آؤ، سویرے۔ ہم اس وقت مریضوں کو نہیں دیکھتے۔

بوڑھے نے گھٹنے ٹیک کر زمین پر سر رکھ دیا اور بولا۔ دہائی ہے سرکار کی، ہجور لڑکا مر جائے گا، چار دن سے آنکھیں...

ڈاکٹر نے کلائی پر نظر ڈالی، چھ بجنے میں صرف دس منٹ باقی تھے، گولف اسٹک ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے۔

کل سویرے آؤ، ہم کھیلنے جاتا ہے۔''

بوڑھے نے پگڑی اتار کر چوکھٹ پر رکھ دی اور رو کر بولا۔ '' ہجور ایک نگاہ دیکھ لیں، لڑکا ہاتھ سے چلا جائے گا۔ سات لڑکوں میں یہی ایک بچ رہا ہے ہجور۔ ہم دونوں آدمی رو رو کر مر جائیں گے۔

ڈاکٹر نے چلمن اٹھائی اور موٹر کی طرف چلے۔ بوڑھا پیچھے پیچھے یہ کہتا ہوا دوڑا۔ '' سرکار بڑا دھرم ہوگا، ہجور دیا کیجئے۔ مگر ڈاکٹر صاحب مطلق مخاطب نہ ہوئے۔ موٹر پر بیٹھ کر بولے۔ کہہ دیا کل سویرے آؤ۔''

موٹر چلی گئی۔ بوڑھا کئی منٹ تک سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ دنیا میں ایسے انسان بھی ہوتے ہیں، شاید اسے اب بھی یقین نہ آتا تھا۔ پھر اس نے کہاروں سے ڈولی اٹھانے کو کہا۔ یہ غریب چاروں طرف سے مایوس ہو کر چڈھا کے پاس آیا تھا۔ ان کی بڑی تعریف سنی تھی۔ یہاں سے جواب پا کر پھر وہ کسی اور ڈاکٹر کے پاس نہ گیا۔ قسمت ٹھونک کی۔

اسی رات کو اس کا سات سالکا ہنستا کھیلتا بچہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔

بوڑھے ماں باپ ہاتھ مل کر رہ گئے۔ زندگی کا یہی ایک سہارا تھا، اس بچہ کا منہ دیکھ کر دونوں جیتے تھے۔

اب دنیاان کے لیے تاریک ہو گئی!

کئی سال گزر گئے، ڈاکٹر چڈھا کی ثروت اور شہرت ماہ نو کی طرح بڑھتی گئی اور صحت توان کی بے مثال تھی۔ یہ ان کی پابندی اوقات کا نتیجہ تھا کہ پچاس سال کے سین میں بھی ان کی چستی و جفاکشی جوانوں کو شرمندہ کرتی تھی۔ اکثر لوگ صحت کے قواعد کی پابندی اس وقت کرتے ہیں جب صحت زائل ہو چکی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر چڈھا علاج اور انسداد کے راز کو خوب سمجھتے تھے ورنہ ڈاکٹر ہی کیوں ہوتے۔ تعین اولاد بھی انہیں قواعد میں تھا۔ ان کے صرف دو بچے ہوئے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ تیسری اولاد نہ ہوئی۔ چنانچہ شریمتی چڈھا کی صحت میں بھی کسی قسم کا ضعف نہ تھا۔ دونوں بچے صحت اور زندہ دلی کے پتلے تھے۔ لڑکی کی تو شادی ہو چکی تھی، لڑکا کالج میں پڑھ رہا تھا۔ سبزہ آغاز نوجوان تھا، مردانہ حسن کا اعجاز، ذہانت کا پتلا۔ تحریر و تقریر میں یونیورسٹی کا مایاناز، چہرہ سے نور برستا تھا ہر ایک دائرہ کا مرکز نگاہ، خوش گلو، خلیق، منکسر۔ آج اس کی بیسویں سالگرہ تھی۔

رات کا وقت تھا۔ ہری ہری گھاس پر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ شہر کے رؤسا اور حکام ایک طرف، کالج کے طلبہ دوسری طرف بیٹھے ہوئے دعوت کھا رہے تھے۔ بجلی کی روشنی سے سارا میدان برق قائم بنا ہوا تھا۔ تفریح کے سامان بھی جمع تھے۔ ایک چھوٹے سے فارس کھیلنے کی تیاری کی گئی تھی۔ فارس خود نوجوان چڈھا کی تصنیف تھی۔ وہی خاص ایکٹر بھی تھا۔ وہ اس وقت ایک ریشمی کرتہ پہنے، ننگے پاؤں، دوستوں کی خاطر و مدارات میں مصروف تھا۔

کوئی پکارتا چڈھا صاحب ذرا ادھر آنا، کوئی ادھر سے پکارتا، چڈھا کیا ادھر ہی رہو گے؟

یکایک ایک حسینہ نے آکر کہا۔ ''کیوں کیلاش! تمہارے سانپ کہاں ہیں، ذرا مجھے بھی دکھادو۔''

چڈھا نے ٹالتے ہوئے کہا۔ " اس وقت معاف کرو مرنالنی، کل دکھادوں گا۔''

مرنالنی نے ایک انداز سے ماتھا سکوڑ کر کہا۔ '' جی نہیں، تمہیں دکھانا پڑے گا۔ میں نہیں ماننے کی، تم یونہی روز کل کل کرتے رہتے ہو۔''

مرنالنی اور کیلاش دونوں ہم جماعت تھے اور ایک دوسرے پر فدا۔ کیلاش کو سانپوں کو نچانے اور کھلانے کا شوق تھا۔ طرح طرح کے سانپ پال رکھے تھے، ان کے عادات و خواص کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ سانپوں پر تھوڑے دن ہوئے انہوں نے یونیورسٹی کلب میں ایک نہایت دلچسپ تقریر کی تھی اور سانپوں کو نچا کر دکھایا تھا۔

ایک بوڑھے سپیرے سے اس نے یہ فن سیکھا تھا۔ سانپوں کی کتنی ہی جڑی بوٹیاں اس نے جمع کر رکھی تھیں۔ مرنالنی کا اصرار بے موقع تھا۔ سانپوں کے کمرہ میں بہت ہجوم ہو جائے گا۔ اس لیے وہ ٹال رہا تھا اور شاید مرنالنی مان بھی جاتی

مگر دوستوں کو چین کہاں؟ ایک صاحب بولے۔ دکھا کیوں نہیں دیتے بھئی؟ ایک ذرا سی بات کے لیے اتنا ٹال مٹول کر رہے ہو۔ مرنالنی ہر گز نہ ماننا، دیکھوں یہ حضرت کیسے نہیں دکھاتے۔ ''دوسرے صاحب بولے۔" مس مرنالنی اس قدر سیدھی اور بھولی ہیں جبھی آپ اتنا مزاج کرتے ہیں، دوسری ہوتی تو اسی بات پر بگڑ کھڑی ہوتی۔''

تیسرے صاحب نے فرمایا۔ اجی بولنا چھوڑ دیتی، صورت نہ دیکھتی۔ اس پر آپ کو دعوی ہے کہ مس مرنالنی کیلئے جان حاضر ہے۔''

مرنالنی نے ان شہروں کی طرف تمسخر کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ '' آپ لوگ میری وکالت نہ کریں، میں اس وقت نہیں دیکھنا چاہتی، چلو چھٹی ہوئی۔"

اس پر دوستوں نے قہقہہ لگایا۔ ایک صاحب بولے۔ دیکھنا تو اب سب چاہیں گے لیکن کوئی دکھائے بھی۔"

کیلاش کو مرنالنی کے بشرے سے معلوم ہوا کہ اس وقت اس کا انکار ناگوار گزرا۔ جونہی دعوت ختم ہوئی اور گانا شروع ہوا، اس نے مرنالنی اور چند احباب کو سانپوں کے ڈربے کے سامنے لے جا کر مہور بجانا شروع کیا۔ پھر ہر ایک خانے کو کھول کھول کر ایک ایک سانپ نکالنے لگا۔ واہ کیا کمال تھا،

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کیڑے اس کی ایک ایک بات کو سمجھتے ہیں۔ کسی کو ہاتھوں میں اٹھالیا، کسی کو گردن میں ڈال لیا۔ کسی کو ماتھے کے گرد لپیٹ لیا۔ مرنالنی بار بار منع کرتی تھی، انہیں گردن میں نہ ڈالو۔ دور ہی سے دکھادو۔ بس ذرا نچادو۔ کیلاش کی گردن میں سانپوں کو لپٹتے دیکھ کر اس کی جان نکلی جاتی تھی۔ افسوس کر رہی تھی کہ میں نے ناحق انہیں چھیڑا مگر کیلاش ایک نہ سنتا تھا۔ معشوقہ کے روبرو اپنے کمال کے اظہار کا ایسا موقع پاکر کون چوکتا ہے۔

ایک صاحب بولے۔ دانت تو توڑ ہی ڈالے ہوں گے۔''

کیلاش نے ہنس کر کہا۔'' جی نہیں بندہ نواز۔ دانت توڑنا مداریوں کا کام ہے، کسی کے دانت نہیں توڑے گئے، کہئے تو دکھادوں؟''

یہ کہہ کر اس نے ایک کالے سانپ کو پکڑ لیا اور بولا۔ '' میرے پاس اس سے بڑا اور زہریلا دوسرا جانور نہیں ہے۔ اگر کسی کو کاٹ لے تو آنا فانا آدمی مر جائے۔ اس کا کوئی علاج نہیں، دکھادوں اس کے دانت''!

مرنالنی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ " نہیں نہیں کیلاش، ایشور کیلئے اسے چھوڑ دو۔ تمہارے پیر پڑتی ہوں۔''

اس پر ایک دوسرے مہربان بولے۔'' مجھے یقین تو نہیں آتا مگر چونکہ تم کہتے ہو، اس لیے مان لیتا ہوں۔''

کیلاش نے سانپ کی گردن پکڑ کر کہا۔

'' نہیں صاحب! آپ آنکھوں سے دیکھ لیجئے تب مانئے۔ دانت توڑ کر قبضہ میں کیا تو مجھ میں اور مداریوں میں فرق ہی کیا رہا۔ سانپ بڑا سمجھدار ہوتا ہے۔ اگر اسے یقین ہو جائے کہ اس آدمی سے مجھے کوئی گزند نہ پہنچے گا تو وہ اسے ہرگز نہ کاٹے گا۔ دانت اس کا آلہ محافظت ہے۔''

مرنالنی نے دیکھا کہ کیلاش پر اس وقت جنوں سوار ہے تو اس نے یہ تماشہ ختم کرنے کو کہا اور بولی۔" اب یہاں سے چلو، دیکھو باہر گانا شروع ہو گیا۔ آج میں بھی کوئی چیز سناؤں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے کیلاش کا کندھا پکڑ کر چلنے کا اشارہ کیا اور کمرہ سے چلی گئی مگر کیلاش معترضوں کو خاموش کر کے ہی دم لینا چاہتا تھا۔ اس نے سانپ کی گردن

پکڑ کر اتنے زور سے دبائی کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جسم کی ساری رگیں تن گئیں۔ سانپ نے اب تک اس کے ہاتھوں اس قسم کا بے رحمانہ برتاؤ نہ دیکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ اسے شاید خیال ہوا کہ یہ مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ اپنی محافظت کیلئے آمادہ ہو گیا۔ کیلاش نے اس کی گردن دبا کر اس کا منہ کھول دیا اور اس کے دانت دکھاتے ہوئے بولا۔ جن صاحبوں کو شبہ ہو، آکر دیکھ لیں، آیا یقین؟ یا اب بھی شک ہے ؟''

دوستوں نے قریب آکر اس کے دانت دیکھے اور کیلاش کے کمال کا اعتراف کرنے لگے۔ عینی شہادت کے سامنے شبہ کی گنجائش کہاں۔ ان کا اطمینان کر کے کیلاش نے سانپ کی گردن ڈھیلی کر دی اور اسے زمین پر رکھنا چاہا مگر وہ کالا گیہوں غضبناک ہو رہا تھا، گردن نرم پڑتے ہی اس نے سر اٹھا کر کیلاش کی انگلی میں زور سے کاٹا اور وہاں سے بھاگا۔ انگلی سے ٹپ ٹپ خون ٹپکنے لگا۔ کیلاش نے فوراً زور سے انگلی دبائی اور اپنے کمرہ کی طرف دوڑا۔ اس کی میز کی دراز میں ایک جڑی رکھی تھی جس کے استعمال سے قابل زہر بھی رد ہو جاتا تھا۔ دوستوں میں ہلچل پڑ گئی۔ ڈاکٹر صاحب بدحواس ہو کر دوڑے۔ وہ جڑی بوٹی کے قائل نہ تھے۔ انگلی کو جڑ سے کاٹ دینا چاہتے تھے۔ پر کیلاش کو جڑی بوٹی پر کامل اعتقاد تھا۔ فوراً جڑی پیسی گئی اور انگلی پر اس کا لیپ کیا گیا۔ کیلاش تو مطمئن ہو کر باقی سانپوں کو ڈرہے میں بند کرنے لگا مگر ڈاکٹر صاحب اور دوسرے احباب پریشان تھے۔ مرنالنی پیانو چھوڑ کر دوڑی آئی تھی۔ وہ بار بار ڈاکٹر

صاحب سے کہتی، آپ نشتر لگا دیجئے مگر ڈاکٹر صاحب تذبذب کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ مشکل سے پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ کیلاش کو سر میں چکر محسوس ہوا اور دیکھتے دیکھتے اس کے چہرہ کا رنگ زرد پڑنے لگا مگر ابھی تک وہ ضبط کئے کھڑا تھا اور سب سے کہتا تھا، آپ لوگ اندیشہ نہ

کریں۔ میں بالکل اچھا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب گو خاموش کھڑے تھے۔ پر کیلاش کے چہرہ کا اڑتا ہوا رنگ دیکھ کر ان کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ آخر نہ رہا گیا، وہ جلدی سے مطب میں آ گئے اور کئی چیزیں ایک گلاس میں ملا کر لائے۔ کیلاش نے ایک بے غرضانہ انداز سے گلاس لے لیا اور منہ میں لگانا چاہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ وہ وہیں زمین پر لیٹ گیا اور ہاتھ سے پنکھا جھلنے کا اشارہ کیا۔ میز کا پنکھا لگا دیا گیا اور تیز ہوا چلنے لگی۔ مرنالنی نے دوڑ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "کیلاش کیسی طبیعت ہے؟ "کیلاش نے ہاتھ اوپر اٹھا دیا، پر منہ سے کچھ نہ بول سکا۔

مسز چڈھا نے بگڑ کر شوہر سے کہا۔ ''کھڑے منہ کیا تاک رہے ہو، کوئی چیز دیتے کیوں نہیں؟''

مرنالنی نے کہا۔ ''ماں دیکھئے، ان کا چہرہ کیسا ہوا جاتا ہے۔''

چڈھا نے پچھتا کر کہا۔ کیا بتلاؤں، میں اس کی باتوں میں آ گیا۔ اب تو نشتر سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوگا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں؟''

یہ کہتے ہوئے انہیں کچھ خیال آ گیا۔ پھر دوڑے ہوئے مطب گئے اور کوئی مرکب بنا کر لائے، بڑی مشکل سے کیلاش کا منہ کھولا گیا اور دوا ڈالی گئی مگر زہر اتنا قاتل تھا کہ دوبارہ لہر نہ آئی۔ دوا کا کچھ اثر نہ ہوا۔ آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ کیلاش کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ چہرہ سفید ہو گیا۔ نبض کا کہیں پتہ نہیں، موت کی ساری علامتیں نمودار ہو گئیں۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ مرنالنی ایک طرف سر پیٹنے لگی۔ ماں الگ پچھاڑیں کھانے لگی اور ڈاکٹر چڈھا تو ایسے بدحواس ہو گئے کہ اگر دوستوں نے نہ پکڑ لیا ہوتا تو شاید اپنے گلے پر نشتر چلا لیتے۔

ایک صاحب بولے۔ کوئی منتر جھاڑنے والا مل جائے تو ممکن ہے، اب بھی جان بچ جائے۔''

دوسرے صاحب نے فرمایا۔ ارے صاحب قبر سے نکلی ہوئی لاشیں زندہ ہو گئی ہیں، ایسے ایسے باکمال پڑے ہوئے ہیں۔

چڈھا نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ '' میری عقل پر پتھر پڑ گیا تھا کہ اس کی باتوں میں آ گیا۔ نشتر لگا دیتا تو یہ نوبت کیوں آتی۔ بار بار سمجھاتا رہا کہ بیٹا سانپ نہ پالو، جان کا خطرہ ہے مگر میری کون سنتا تھا، بلایئے کسی جھاڑنے والے کو بلایئے، میرا سب کچھ لے لے۔ میں اپنی ساری جائیداد اس کے پیروں پر رکھ دوں گا۔ لنگوٹی باندھ کر گھر سے نکل جاؤں گا مگر میرا کیلاش میرا لخت جگر اٹھ بیٹھے۔ ایشور کیلئے بلایئے، مجھ پر رحم کیجئے۔''

بنگلہ سے کچھ دور پر کئی گوالے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک سانپ کا منتر جانتا تھا۔ اس نے آ کر کئی بار منتر پڑھا۔ کئی بار کیلاش کے کان میں چلایا۔ پھر پچاسوں گھڑے پانی اس کے اوپر ڈلوائے۔ پر بازیافت کی کوئی علامت نہ دیکھ کر مایوس چلا گیا۔ ایک دو منتر والے اور بھی آئے، ان سبھوں نے بھی منتر پڑھے۔ دوائیں پلائیں، سونگھائیں نہلایا، شور مچایا مگر کوئی نتیجہ نہ دیکھ کر رخصت ہو گئے۔ چوتھے نے آ کر کیلاش کی صورت دیکھتے ہی کہا۔

''اب میں کیا منتر پڑھوں سرکار، جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔''

ظالم! یہ کیوں نہیں کہتا کہ جو کچھ نہ ہونا تھا ہو چکا، جو کچھ ہونا تھا، وہ کہاں ہوا۔ ماں باپ نے بیٹے کا سہرا کہاں دیکھا۔ مرنالنی کو آغوش محبت میں بیٹھنا کہاں نصیب ہوا۔ زندگی کے وہ سنہرے خواب جن سے زندگی نوبہار ہو جاتی تھی، کیا وہ پریشان نہیں ہو گئے۔ تمناؤں کی زرنگار جھیلوں میں لطف سیر اٹھاتے ہوئے کیا ان کا بجرا غرقاب نہیں ہو گیا۔ جو ہونا تھا وہ کہاں ہوا۔ جو کچھ نہ ہونا تھا وہ البتہ ہو گیا۔

وہی نورانی سبزہ زار تھا۔ وہی سنہری چاندنی ایک نغمۂ خاموش کی طرح منظر پر چھائی ہوئی تھی۔ وہی مجمع احباب تھا، وہی تفریح کے سامان تھے مگر اب ان پر تارے ماتم کرتے تھے اور شبنم آنسو بہائی تھی۔ بارات وہی تھی، پر دلہا رخصت ہو گیا تھا۔

ایک چھوٹے سے کچے مکان میں ایک بوڑھا اور ایک بڑھیا انگیٹھی کے سامنے بیٹھے جاڑے کی رات کاٹ رہے تھے۔ انگیٹھی میں آگ نہ تھی، صرف من کو بہلانے کا ایک سامان تھا۔ زمین پر پڑی ہوئی پوال اور دو تار تار کمبل خوش آئند نیند کے ضامن نہ ہو سکتے تھے۔ انگیٹھی میں کم سے کم گرم راکھ

تو تھی، دونوں خاموش تھے۔ دونوں صبر کے پتلے اور صبر بھی کیسا؟ بے عذر، ان کی زبان پر نہ زمانہ کا شکوہ تھا، نہ مرنے والوں کا ذکر غم! ان کا سارا وقت مصاف حیات میں صرف ہوتا تھا۔ موت دروازہ پر کھڑی دستک دے رہی تھی۔ باتوں کی کہاں فرصت، فروا ہی نہ ہو تو غم کس کا۔

بڑھیا نے بڑی دیر کے بعد پوچھا۔" کل کے لیے سن تو ہے ہی نہیں، کیا ہو گا؟"

ہے۔

"جا کر جھگڑو ساہ سے ادھار لاؤں گا۔"

اس کے پہلے کے پیسے تو ابھی دیئے ہی نہیں، ادھار نہ دے گا۔"

"نہ دے گا نہ سہی، گھاس تو کہیں نہیں گئی ہے۔ دوپہر تک کیا دو آنہ کی بھی نہ چھیل سکوں گا اور کیا کرنا ہے۔

اتنے میں ایک آدمی نے دروازہ پر دستک دی۔ بھگت، سو گئے کیا؟ ذرا کواڑ کھولو، میں ہوں منگلی۔"

بھگت نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ منگلی نے کوٹھڑی میں آ کر کہا۔" کچھ سنا۔ چڈھا بابو کے لڑکے کو سانپ نے کاٹ لیا؟"

بھگت نے چونک کر سر اٹھایا۔ " چڈھا بابو کے لڑکے کو؟ وہی چڈھا بابو ہیں نا جو بنگلے میں رہتے ہیں، پورب طرپھ۔

منگلی نے کہا۔" ہاں ہاں وہی، نامی آدمی ہیں، چاروں اور ہلا مچا ہوا ہے۔ جاتے ہو وہاں؟ آدمی بن جاؤ گے"!

بوڑھے نے بے رحمانہ انداز سے کہا۔" میں نہیں جاتا، میری بلا جائے۔ وہی چڈھا ہیں، کھوب (خوب) جانتا ہوں، آدمی نہیں کسائی (قصائی) ہے۔ آج آٹھ سال ہوئے۔

بڑھیا نے حج کی۔ نواں لگا ہے۔"

بوڑھا۔" ہاں نواں سال ہے۔ میں پنا کو لے کر دکھانے گیا تھا۔ کھیلنے جا رہے تھے۔ پیروں پر گر پڑا کہ ایک نجر (نظر) دیکھ لیجئے مگر اس نے بات تک نہ سنی۔ بھگوان بیٹھے سن رہے تھے۔ اب معلوم ہو گا کہ بیٹے کا گم (غم) کیسا ہوتا ہے۔ کئی لڑکے ہیں؟"

منگلی " نہیں جی، یہی تو ایک لڑکا ہے۔ سنا ہے سب لوگوں نے جواب دے دیا۔ گنگو گوالا، تدو بہنا، منے مصر سب ہار کر چلے آئے۔"

بوڑھا۔ " بھگوان بڑا کارساج (کارساز) ہے۔ ارے تم سے کیا کہوں، اس کے پیروں پر گر کر رویا۔ اس کے پیروں پر پگڑی اتار کر رکھ دی مگر اسے ذرا بھی دیا نہ آئی۔ میں تو اس کے دروجے (دروازے پر ہوتا تب بھی بات نہ پوچھتا۔ ایسے لوگوں کی یہی سجا (سزا) ہے۔"

منگلی۔ تو نہ جاؤ گے؟ ہم نے تو سنا تھا، تم سے کہہ دیا۔"

بوڑھا۔ بہت اچھا کیا، سن کر کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔ آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ تم جاؤ، آج چین کی نیند سوؤں گا۔ (بڑھیا سے) جرا تما کو لے لے، ایک چلم اور پیوں گا۔ اب معلوم ہو گا لالہ کو، ساری صاحبی بھول جائے گی۔ ہمارا کیا بگڑا، کچھ لڑکے کے مر جانے سے راج تو نہیں چلا گیا۔ تمہارا تو راج سونا ہو جائے گا۔ اسی لڑکے کے واسطے سب کا گلا دبا دبا کر دھن جوڑا تھا نا، اب کیا کرو گے؟"

منگلی چلا گیا۔ بھگت نے چلم اٹھالی اور پڑوس کے حلوائی کی بھٹی سے آگ رکھ لایا، پھر کواڑ بند کر کے اطمینان سے چلم پینے لگا۔

بڑھیا نے کہا۔ اتنی رات گئے جاڑے پالے میں بھیجنے آیا تھا۔ موئے کو شرم بھی نہ آئی۔"

رات نہیں، دوپہر بھی ہوتی تو میں نہ جاتا۔ اس کی سواری دروازے پر آتی تو بھی نہ جاتا۔ بھول نہیں گیا ہوں۔ پنا کی صورت آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ اس نرموہی نے ایک نجر بھی تو نہیں دیکھا۔ کیا میں نہ جانتا تھا کہ وہ نہ بچے گا؟ کھوب جانتا تھا، وہ بھگوان نہیں تھا کہ اس کے ایک نجر دیکھ لینے سے امرت برس جاتا۔ نہیں کھالی (خالی) من کی دوڑ تھی۔ جرا تسکین ہو جاتی، بس اسی لیے اس کے پاس دوڑا گیا تھا۔ اب کسی دن پھر جاؤں گا اور

کہوں گا۔ کیوں صاحب! کہئے کیا رنگ ہے؟ دنیا مجھے برا کہے گی، کہے، کوئی پروا نہیں۔ چھوٹے آدمیوں میں تو سب عیب ہوتے ہی ہیں۔ بڑوں میں کوئی عیب نہیں ہوتا۔ وہ دیوتا ہوتے ہیں۔"

اسی سال کی عمر میں بھگت کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ ایسے سانحے کی خبر سن کر بھی وہ گھر سے باہر نہیں نکلا۔ ماگھ پوس کی اندھیری رات، جیٹھ بیساکھ کی دھوپ اور لو، ساون بھادوں کے موسلا دھار مینہ، کسی کی اس نے کبھی پروا نہ کی۔ وہ فوراً گھر سے نکل پڑتا تھا۔ بے منت، بے غرض، معاوضہ کا خیال کبھی دل میں آیا ہی نہیں، نہ کبھی کسی نے کچھ دیا ہی۔ یہ معاوضہ کا کام ہی نہ تھا۔ جان کا کیا معاوضہ۔ یہ ایک کار ثواب تھا، اسے جو ودیا آتی تھی، اس کا لازمی استعمال۔ سینکڑوں مایوسوں کو اس کے منتروں نے زندگی عطا کر دی تھی، پر آج وہ گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتا۔

اپنے کانوں سے یہ خبر سن کر بھی اطمینان سے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

بڑھیا نے کمبل اوڑھ کر لیٹتے ہوئے کہا۔" تماکو کے ڈھائی پیسے ہو گئے۔ آج دیتی ہی نہ تھی۔"

بھگت نے کپی بجھائی اور کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر بیٹھ کر کچھ سوچتا رہا۔ بعد ازاں لیٹ گیا۔ یہ خبر اس کے جگر پر بوجھ کی طرح رکھی ہوئی تھی۔ اسے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے۔ جیسے سارے کپڑے گیلے ہو گئے ہیں یا پیروں میں کیچڑ لگا ہوا ہے۔ جیسے کوئی اس کے دل کے اندر بیٹھا ہوا اسے گھر سے نکلنے کیلئے تحریک کر رہا ہو۔

بڑھیا ذرا دیر میں خراٹے لینے لگی۔ بوڑھے بولتے بولتے سو جاتے ہیں اور چوہے کا رینگنا سن کر جاگ اٹھتے ہیں۔ بھگت کو جب اطمینان ہو گیا کہ بڑھیا سو ہو گئی ہے تو وہ اٹھا، اپنی لکڑی ٹٹول کر اٹھائی اور دھیرے سے کواڑ کھولے۔

بڑھیا چونک پڑی، بولی۔ کہاں جاتے ہو؟"

کہیں نہیں، دیکھتا تھا کتنی رات گئی ہے۔"

بھی بہت رات ہے، سو جاؤ۔"

نیند نہیں آتی۔"

"نیند کاہے کو آئے گی۔ من تو چڈھا با ہو کے گھر پر لگا ہوا ہے۔"

چڈھا بابو نے میرے ساتھ ایسی کونسی نیکی کر دی ہے جو وہاں جاؤں۔ وہ آکر پیروں پڑیں تب بھی نہ مانوں۔

چاہے نہ مانو پر تم اٹھے اس ارادہ سے تھے۔"

نہیں ری، ایسا پاگل نہیں ہوں کہ جو مجھے کانٹے ہوئے اس کے لیے پھول بوتا پھروں۔"

بڑھیا پھر سو گئی، بھگت نے کواڑ لگا دیئے اور پھر آکر بیٹھا مگر اس کے دل کی حالت اس کتے کی سی ہو رہی تھی جو رات کو کسی اجنبی کی آہٹ پا کر مالک کے منع کرنے پر بھی بھونکنا نہیں چھوڑتا اور زور سے چاہے نہ بھونکے مگر آہستہ آہستہ غراتا رہتا ہے۔ بھگت کا نفس اسے اپنی پوری طاقت سے روک رہا تھا، پر اس کے وجود کا ایک ایک ذرہ ہوا کے جھونکے سے اڑے ہوئے پتے کی طرح اس بدنصیب نوجوان کی طرف اڑا جا رہا تھا جو اس وقت مر رہا تھا اور جس کے لیے ایک ایک لمحہ کی دیر بازیافت کے امکان کو اور دور ٹال رہی تھی۔

اس نے پھر کواڑ کھولے، اتنے آہستہ سے کہ بڑھیا کو خبر نہ ہوئی۔ باہر نکل آیا، اسی وقت محلہ کا چوکیدار گشت کر رہا تھا۔ بولا " کیسے اٹھے بھگت۔ آج تو بڑی سردی ہے۔ کہیں جا رہے ہو کیا؟"

بھگت نے کہا۔ " نہیں جی، جاؤں گا کہاں۔ دیکھتا تھا کہ ابھی کتنی رات ہے۔ بھلا کے بجے ہوں گے؟"

ایک بجا ہو گا اور کیا۔ ابھی تھانے سے آرہا تھا تو چڈھا کے بنگلے پر بڑی بھیڑ لگی تھی۔ ان کے لڑکے کا حال تو تم نے سنا ہو گا۔ کالے نے چھو لیا ہے، چاہے مر بھی گیا ہو۔ تم چلے جاؤ تو سائت (شاید) بچ جائے۔ سنا ہے دس ہجار (ہزار) تک دینے کو تیار ہیں۔ نہ دس ہجار دیں گے، دس سو تو دیں گے۔''

میں تو نہ جاؤں گا چاہے وہ دس لاکھ بھی دیں۔ مجھے دس ہجار لے کر کرنا ہی کیا ہے۔ کل کو مر جاؤں گا تو کون بھوگے گا۔ میں ان کے درواجے پر ہوتا تب بھی نہ جاتا۔ ایسے بے دردوں کی سجا یہی ہے۔

چوکیدار چلا گیا۔ بھگت نے آگے پیر بڑھائے۔ جیسے کسی مخمور آدمی کا اپنے فعلوں پر قابو نہیں ہوتا۔ وہ کہتا کچھ ہے، زبان سے نکلتا کچھ ہے۔ وہ اپنی دانست میں پاؤں سنبھال کر رکھتا ہے، پر وہ لغزش کرتے ہیں۔ وہی حالت بھگت کی تھی۔ نفس انتقام پر تلا ہوا تھا، پر عمل پر اس کا قابو نہ تھا۔ جس نے کبھی تلوار نہیں چلائی، وہ ارادہ کرنے پر بھی تلوار نہیں چلا سکتا۔ اس کے ہاتھ کانپتے ہیں۔

دو میل کا راستہ تھا۔ بھگت لاٹھی کھٹ کھٹ کرتا چلا جاتا تھا۔ ادراک ثانی اولی پر حاوی تھا۔ اولی روکتا تھا۔ ثانی تھپلتا تھا۔ آدھا راستہ طے ہو جانے پر یکایک بھگت رک گیا۔ نفس نے قوت عمل پر فتح پائی۔

ارے میں اتنی دور چلا آیا! اس جاڑے پالے میں مجھے مرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آرام سے پڑا کیوں نہ رہا۔ نہ نیند آتی دو چار بھجن ہی گاتا، ناحق اتنی دور دوڑا۔ چڈھا کا لڑکا رہے یا جائے، میری بلا ہے۔ مجھے کیا کرنا ہے۔ دنیا میں ہزاروں مرتے ہیں۔

ہزاروں جیتے ہیں۔ مجھے کسی کے مرنے جینے سے مطلب، جس نے میرے ساتھ ذرا بھی سلوک نہیں کیا، اس کے ساتھ میں کیوں سلوک کروں؟

مگر نفس کی یہ فتح عارضی تھی، وہ ادراک ثانی جو اسے اتنی دور لایا تھا، ایک دوسری ہی صورت میں نمودار ہوا جو نفس سے بہت متشابہہ تھا۔

میں وہاں کچھ سانپ کا منتر پڑھنے تھوڑا ہی جا رہا ہوں، ذرا دیکھوں گا، لوگ کیا کرتے ہیں۔ ذرا ڈاکٹر صاحب کا رونا پیٹنا دیکھوں گا۔ کس طرح سر پیٹتے ہیں، کس طرح پچھاڑیں کھاتے ہیں۔ ذرا دیکھوں گا بڑے لوگ بھی ہمیں لوگوں کی طرح روتے ہیں یا صبر کر جاتے ہیں۔ وہ لوگ تو دوان ہوتے ہیں، من میں سمجھ کر رہ جاتے ہوں

گے۔

اس طرح نفس کو دھوکا دیتا ہوا شیطانکو بہکاتا ہوا وہ چلا جا رہا تھا کہ دو آدمی راستہ سے گزرے، دونوں میں ڈاکٹر چڈھا ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک نے کہا۔ چڈھا بابو کا گھر اجڑ گیا۔ دوسرا بولا۔ کسل بھی ہے کہ ابھی بیاہ نہیں ہوا تھا۔ " بھگت کی چال اور بھی تیز ہو گئی۔ ضعف کے مارے قدم نہ اٹھتے تھے مگر ہمت ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ سر کا حصہ اتنا آگے بڑھا جاتا تھا گویا اب منہ کے بل گر پڑے گا۔ اس طرح کوئی بیس منٹ چلا ہو گا کہ ڈاکٹر صاحب کا بنگلہ نظر آیا۔ بجلی کی بتیاں روشن تھیں مگر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نالہ وشیوں کی صدائیں بھی نہ سنائی دیتی تھیں۔ اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ کہیں دیر تو نہیں ہو گئی۔ وہ دوڑنے لگا۔ اپنی عمر میں وہ اتنا تیز کبھی نہ دوڑا تھا۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا، گویا اس کے پیچھے موت دوڑی آرہی ہے۔

کیلاش بے جان پڑا ہوا تھا۔ جسم ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ ہونٹ سیاہ پڑ گئے تھے۔ زندگی کی کوئی علامت باقی نہ تھی۔ مگر کوئی بلند آواز سے نہ روتا تھا۔ گریۂ خاموش ڈوبنے والی امید کی آخری شعاع تھی۔

یکایک بھگت نے برآمدہ میں پہنچ کر پکارا۔ ڈاکٹر صاحب نے سمجھا، کوئی مریض آیا ہو گا۔

کسی اور وقت انہوں نے اس آدمی کو دھتکار دیا ہوتا۔ رات کے وقت وہ کسی مریض کو نہ دیکھتے تھے مگر آج وہ فوراً گھر میں سے نکل آئے اور رقت آمیز انداز سے بولے۔ "کیا ہے بھئی، آج تو ہمارے اوپر ایسی مصیبت آپڑی ہے کہ کچھ کہتے نہیں بنتا پھر کبھی آنا۔''

بھگت نے کہا۔'' سب حال سن چکا ہوں بابو صاحب! اسی لیے تو آیا ہوں۔ جرا میں بھی دیکھ لوں۔ چھوٹے بھیا کہاں ہیں۔ بھگوان بڑا کارساج ہے۔ کون جانے اب بھی اسے دیا آجائے۔"

ڈاکٹر چڈھانے مایوسانہ انداز سے کہا۔'' اچھی بات ہے چلو دیکھ لو، تین چار گھنٹے ہو گئے ہیں، ہم تو نراش ہو گئے۔''

بھگت نے اندر جا کر ایک منٹ تک لاش کو دیکھا۔تب مسکرا کر بولا۔'' ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے بابو جی۔ نارائن چاہیں گے تو آدھ گھنٹہ میں بابو جی اٹھ بیٹھیں گے۔ جرا کہاروں سے کہئے پانی تو بھریں۔''

بوڑھے کا لہجہ اتنا یقین انگیز تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو بھی کچھ امید پیدا ہو گئی۔ بولے۔"بوڑھے بابا بس یہی سمجھ لیجئے کہ ہم سب عمر بھر آپ کے غلام بنے رہیں گے۔اس لڑکے پر ہم اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہیں۔''

مسز چڈھا نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ دادا یہی ہماری جنم بھر کی کمائی ہے۔ بس اور کیا کہوں۔

بوڑھے بھگت کے پاس ایک ایسی جڑی تھی کہ سانپ کیسا ہی زہریلا ہو، اس کا زہر زائل ہو جاتا تھا۔اس جڑی کے ساتھ ہی وہ ایک منتر بھی پڑھتا تھا۔ اس منتر میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ پہلے ہی دم میں مار گزیدہ کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ بھگت کو اپنے ردزہر کی طاقت پر پورا اعتماد تھا۔آج تک اسے کبھی ناکامی نہ ہوئی تھی۔اس لیے وہ اس قسم کی خبر پاتے ہی اضطراری طور پر گھر سے نکل پڑا تھا۔ وہ آدھ گھنٹہ تک کھڑا منتر پڑھتا رہا۔ایک بار منتر ختم ہو جانے پر وہ کیلاش کو جڑی سونگھا دیتا تھا۔ادھر کہار لوگ کیلاش کے سر پر پانی انڈیلتے چلے جاتے تھے۔ دو بجتے بجتے کیلاش نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ بیٹھا۔

بھگت نے پوچھا۔'' بابو یہاں کسی کو پہچانتے ہو؟''

کیلاش نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر کہا۔'' ہاں صاحب، سب کو پہچانتا ہوں۔ وہ پاپا ہیں، یہ ماما ہیں، وہ مرنالنی ہیں۔''

مسز چڈھا بھگت کے پیروں پر گر پڑیں۔ڈاکٹر چڈھا دوڑ کر کیلاش کے گلے سے لپٹ گئے۔چاروں طرف سے احباب نے مبارکباد دینا شروع کیا۔ باہر ہلچل مچ گئی۔ کمرہ میں دوستوں کا ایسا ہجوم ہوا کہ تل رکھنے کی جگہ بھی نہ رہی۔ ہر شخص بھگت کے درشنوں کا مشتاق تھا۔ڈاکٹر صاحب نے لپک کر اپنا سیف کھولا اور گنیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی نکال لائے۔ وہ اسے بھگت کے پیروں پر رکھ دینا چاہتے تھے مگر جب تھیلی لے کر کمرہ میں پہنچے تو بھگت کا کہیں پتہ نہ تھا۔چاروں طرف بھگت کی تلاش ہونے لگی۔ کہاں گئے، کہاں گئے، ابھی تو یہیں کھڑے تھے۔ بھیتر باہر سب جگہ چھان ڈالی گئی مگر بھگت کا کہیں پتہ نہ تھا۔

سر چڈھا نے کہا۔ کوئی دیوتا تھا۔''

احباب نے کہا۔'' ہاں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔''۔

پھر جشن شروع ہوا۔ نغمہ کی صدائیں بلند ہوئیں اور باجے بجنے لگے